بہارِ کشمیر

مولفہ و مرتبہ

مولوی سید محمد ضامن علی صاحب ایم۔اے

صدر شعبہ اُردو۔ الہ آباد یونیورسٹی

پبلشرز

نند کشور اینڈ برادرز بنارس

بار دوم سنہ ۱۹۳۳ء قیمت ۸ر

بہارِ کشمیر

جس میں

کشمیر اور جموں کے تاریخی۔ تمدنی۔ اخلاقی حالات اور
مناظر قدرت دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں

مولفہ ومرتبہ

مولوی سید محمد ضامن علی صاحب ایم۔اے
صدر شعبہ اُردو۔ الہ آباد یونیورسٹی

پبلشرز

نند کشور اینڈ برادرز۔ بنارس

بار دوم سنہ ۱۹۳۲ء قیمت ۸ر

باہتمام پنڈت بشمبھر ناتھ بھارگو اسٹینڈرڈ پریس الہ آباد میں چھپا

مقدمہ

نصاب تعلیم میں لڑکوں کی واقفیت بڑھانے اور اُن کی نظر وسیع کرنے کے لئے اگرچہ بہت سی ایسی کتابیں داخل ہیں جن میں مختلف ملکوں کے حالات اور وہاں کے باشندوں کی اخلاقی اور تمدنی حالت درج ہے مگر کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں ہندوستان اور اس کے باشندوں کی طرز معاشرت کا بھی ذکر ہو۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مناظر قدرت۔ موسم اور آب وہوا کے لحاظ سے ہندوستان میں ایسے خطے بھی موجود ہیں جن کی نظیر کسی اور ملک میں نہ ملیگی۔ یہاں کے باشندوں میں جو مذہبی۔ اخلاقی۔ تمدنی اور معاشرتی اختلاف ہے وہ معلومات اور تحقیقات کے لئے بجائے خود ایک دلچسپ موضوع ہے۔ جب تک کہ لڑکے اپنے ملک کے حالات قدرت کے عطیات۔ آب وہوا کی کیفیت۔ موسم کے اثر۔ پھل۔ پھول پیداوار اور معدنیات وغیرہ سے و نیز ملک کے مختلف اقوام کی معاشرتی۔ تعلیمی۔ مذہبی اور تمدنی حالات سے واقف نہ ہوں وطن کی عظمت اور محبت ان کے دل میں نہیں پیدا ہو سکتی اور نہ اس کی قدر ہو سکتی ہے۔ بلکہ اندیشہ اس کا ہے کہ دیگر ممالک کے حالات کی واقفیت اور اپنے ملک سے قطعی لاعلمی ان کی خودداری اور خود اعتمادی کے احساس کو مٹا کر اپنی حالت سے نفرت نہ پیدا کردے اور ترقی کے راستے مسدود نہ کردے۔

ہر شخص کو اس کی استطاعت نہیں ہے اور نہ مثل اور ممالک کے یہاں

کا یہ دستور ہے کہ والدین اپنے لڑکوں کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں بھیجیں تاکہ ان کو اپنی معلومات بڑھانے اور تجربہ حاصل کرنے کا موقع ملے۔ اطراف وجوانب کے حالات سے بے خبر رہنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکوں میں تنگ نظری اور پست ہمتی پیدا ہو جاتی ہے نہ ترقی کرنے کا ولولہ باقی رہتا ہے اور نہ فراخ دلی کا مادّہ۔

ان امور کو پیش نظر رکھ کر میں نے ہندوستان کے دو خطّوں کو جن میں سے ایک شمال اور دوسرا جنوب میں واقع ہے منتخب کیا اور وہاں کے ضروری حالات بہت محنت اور کوشش سے یکجا کرکے دو کتابیں مرتب کیں۔ ایک کا نام بہار کشمیر اور دوسری کا نام گوہر سیلون رکھا۔ اگر فرصت ملی اور سررشتہ تعلیم نے یہ خدمت قبول کی تو آیندہ ہندوستان کے بعض وسطی و نیز مغربی و مشرقی خطّوں کے حالات کو بھی اسی طرح پیش کروں گا۔

خدا کرے کہ یہ دونوں کتابیں لڑکوں کی تعلیم میں معین ہوں اور قبول عام کی سند حاصل کریں۔

مولف

الہ آباد یونیورسٹی
۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان مضامین	صفحہ
۱	کشمیر کا تعارف	۱
۲	کشمیر جانے کے راستے	۵
۳	راولپنڈی سے سری نگر تک کا سفر	۹
۴	ایضاً " "	۱۴
۵	کشمیر کی قدیم تاریخ	۲۰
۶	کشمیر میں دوگرا راجپوتوں کی سلطنت	۲۹
۷	سری نگر اور وہاں کے باشندوں کی عام حالت	۳۶
۸	کشمیر کے آثار قدیمہ	۴۹
۹	کشمیریوں کا مذہب	۵۶
۱۰	سری نگر کا شہر اور اس کی صنعت وحرفت	۵۸
۱۱	کشمیر کے پہاڑ اور سرسبز میدان	۶۵
۱۲	کشمیر کی دریائی زندگی	۷۲
۱۳	کشمیر کی جھیلیں اور باغات	۸۱
۱۴	کشمیر کے پھل پھول اور جانور	۹۰



वसन्त ऋतु । — موسم بہار

بہارِ کشمیر

کشمیر کا تعارف

کشمیر ہندوستان کے شمالی مغربی گوشے میں ایک بہت بڑی خود مختار ریاست ہے۔ اس ریاست کا زیادہ تر حصہ پہاڑی ہے یہ پہاڑ قریب قریب سال بھر برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ دوسرے پہاڑی ملکوں سے کشمیر کا مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس ولایت میں پہاڑوں کے درمیان درمیان میدانوں کی طرح مسطح زمین بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ خود کشمیر کی خاص آبادی ایک بہت بڑے میدان میں ہے جو سطح سمندر سے تقریباً ۵۰۰۰ فٹ بلند ہے اور ۸۰ میل

لمبا اور ۲۰ میل چوڑا ہے۔ برف آلود پہاڑوں کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے اس میدان میں ایک عجیب قدرتی حسن پیدا ہو گیا ہے جس کے باعث اس کا شمار دنیا کے حسین ترین مقامات میں ہوتا ہے۔

پنجاب کا مشہور دریائے سندھ اس ریاست کے درمیان سے ہو کر بہتا ہے۔ جو حصہ کشمیر کا اس دریا کے اتر کی طرف ہے وہ بالکل پہاڑی ہے اور کہیں پر سوائے دو ایک جگہوں کے ۱۲۰۰۰ فٹ سے کم اونچا نہیں ہے۔ برخلاف اس کے جو حصہ کشمیر کا اس دریا کے دکھن جانب ہے اس میں علاوہ پہاڑوں کے کہیں کہیں بڑے بڑے مسطح میدان بھی ہیں جن کی سرسبزی اور شادابی سے آنکھوں کو تراوٹ اور دل کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔

کشمیر میں جو قدرتی مناظر پہاڑوں پر دیکھنے میں آتے ہیں وہ دنیا بھر میں کسی اور ملک میں نصیب نہیں ہو سکتے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ علاوہ برف سے ڈھکے رہنے کے ان پہاڑوں پر مختلف قسم کے سرسبز درخت اور جھاڑیاں بکثرت پیدا ہوتی ہیں جن میں رنگ برنگ کے پھول نکلتے ہیں۔ ان پھولوں کی رنگینی اور درختوں کی سرسبزی پہاڑوں کی بلند چوٹیوں سے ملکر ایک عجیب منظر پیدا کرتی ہیں جس کو دیکھ کر خدا کی قدرت یاد آتی ہے۔

پہاڑوں ہی کی کثرت سے یہاں کی آب و ہوا بہت خوشگوار ہوگئی ہے۔یہاں کبھی تیز اور تکلیف وہ گرمی نہیں پڑتی۔اکتوبر سے لیکر اپریل تک سخت سردی ہوتی ہے۔اس زمانہ میں اکثر تالاب اور جھیلوں کا پانی جم جاتا ہے۔ان تمام باتوں کے علاوہ یہاں کی ہوا ایسی روح پرور اور صحت بخش ہے کہ زندہ کا کیا ذکر ہے مردہ چیزوں میں بھی وہاں کی ہوا لگنے سے جان پیدا ہو جاتی ہے۔آب و ہوا کی لطافت. پھول پھل اور سرسبز درختوں کی کثرت۔ہرے بھرے پہاڑوں کے دلفریب منظر۔نہروں چشموں اور جھیلوں کی خوشگوار اور تازی ہوا میدانوں اور وادیوں کی دلکش بہار نے اس ملک کو جنت کا نمونہ بنا دیا ہے جہاں قدرت نے کشمیر کے باشندوں کو اتنی نعمتیں عطا کی ہیں وہاں ان لوگوں کو بارش سے ایک حد تک محروم رکھا ہے۔کیونکہ پہاڑ موسمی ہواؤں کو راستہ میں روک لیتے ہیں اور اس خطہ تک نہیں آنے دیتے لیکن یہاں جھیل۔دریا اور پہاڑی چشمے اس کثرت سے ہیں کہ لوگ بارش کی کمی کو عموماً محسوس نہیں کرتے اور اپنے روزمرہ کے استعمال کے لئے۔گیہوں۔جو۔مکئی۔دھان۔اور مختلف قسم کی دالوں کی کاشت کرتے ہیں۔قدرتی طور پر اس خطہ کی آب و ہوا پھلوں اور میووں کی کاشت کے لئے بہت موزوں ہے۔ پھلوں میں سیب.

ناسپاتی اور انگور میووں میں بادام۔ اخروٹ اور پستہ وغیرہ اس کثرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ مقامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد کثیر مقدار میں دوسرے ملکوں کو بھی بھیجے جاتے ہیں۔

آب وہوا کی لطافت کی وجہ سے یہاں کے باشندے بہت تندرست گورے اور خوبصورت ہوتے ہیں یہاں کی عورتیں خاص کر اسقدر حسین ہوتی ہیں کہ شاید ہی دوسرے ملک میں ہوتی ہوں۔ حسین ہونے کے علاوہ ان عورتوں میں ایک خاص بات یہ ہوتی ہے کہ وہ امور خانہ داری میں بہت طاق اور انتہا سے زیادہ ذہین ہوتی ہیں جس کے باعث ان کے حسن کو اور بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔

افغانستان کی سرحد سے ملحق ہونے کی وجہ سے اس ملک میں زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہے۔ حال کی مردم شماری کے لحاظ سے ریاست کی موجودہ آبادی ۳۶۴۵۳۹ ہے جس میں تقریباً ۹۸ فیصدی مسلمان ہیں لیکن یہاں کے مسلمان بہت زیادہ تنگدست اور نادار ہیں اور عموماً دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ دیہات میں بودوباش رکھنے کی وجہ سے خود ریاست کی بھی ان لوگوں کی طرف خاص توجہ نہیں ہے برخلاف اس کے اگرچہ ہندوؤں کی آبادی کم ہے مگر پھر بھی یہ لوگ سب کے سب خوشحال ہیں اور امن وچین سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

یوں تو قدرت کے جلووں سے ہندوستان کا کوئی گوشہ خالی نہیں ہے لیکن کشمیر کے خطہ کا عالم ہی نرالا ہے۔ پھول پھل اور درختوں کی تازگی پہاڑوں کے قدرتی مناظر۔ نہروں چشموں اور جھیلوں کی موجودگی اور سرسبز میدانوں کی پرفضا بہار اس خطہ کو حقیقتاً جنت کا نمونہ بنائے ہوئے ہیں۔ اس پر وہاں کے باشندوں کی قدرت پرستی نے اور بھی سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ وہ لوگ ان تمام خداداد نعمتوں کے دل اور زبان سے معرف ہیں اور ان سے لطف اندوز ہو کر صانع عالم کی یکتائی اور قدرت کا ہر وقت دم بھرتے رہتے ہیں۔

کشمیر جانے کے راستے

جو لوگ کشمیر جانا چاہیں وہ راولپنڈی یا سیالکوٹ تک ریل پر جا سکتے ہیں۔ راولپنڈی سے تین راستے سری نگر جاتے ہیں۔ اور سیالکوٹ سے ایک راستہ جموں ہوتا ہوا سری نگر جاتا ہے۔ راولپنڈی اور سیالکوٹ دونوں مقاموں سے سری نگر تک کے لئے ہر قسم کی سواریاں ملتی ہیں۔ یوں تو لوگ زیادہ تر موٹروں پر سفر کرتے ہیں لیکن اگر کشمیر کی قدرتی مناظر کا لطف حاصل کرنا ہو تو اس حالت میں سب سے بہتر سواری تانگے کی ہے۔

کشمیر کے تانگے ہندوستان کے تانگوں کے سے نہیں ہوتے۔ تانگے پر تین مسافر اور ایک کوچبان آرام سے بیٹھ سکتے ہیں اس سے زیادہ کی ان میں گنجایش نہیں ہوتی۔ لیکن کشمکش کے ساتھ ایک تانگے پر کوچبان کو ملا کر پانچ آدمی تک بھی بیٹھ سکتے ہیں۔ سڑک خراب اور ناہموار ہے اس لئے ان تانگوں میں دو گھوڑے جوتے جاتے ہیں۔ یہ گھوڑے اگرچہ شہر کے گھوڑوں کا خوبصورتی میں مقابلہ نہیں کر سکتے مگر ان سے کہیں زیادہ جفاکش ہوتے ہیں۔ پہاڑی راستوں کو طے کرنا انہیں کا کام ہے۔ شہر کے گھوڑے ان راستوں پر ایک منٹ بھی کام نہیں دے سکتے۔ بجائے گھنٹی کے تانگے کے دھرے میں چار پانچ لوہے کی چوڑیاں ڈال دی جاتی ہیں۔ جب تانگہ چلتا ہے تو اس کی حرکت سے چوڑیاں خودبخود گھومتی ہیں۔ اُس سے ایک خاص قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس آواز سے پیدل چلنے والے سمجھ جاتے ہیں کہ پیچھے تانگہ آ رہا ہے اور راستہ صاف کر دیتے ہیں۔

موٹریں اور لاریاں راولپنڈی اسٹیشن کے باہر ہی سیکڑوں کی تعداد میں کھڑی رہتی ہیں۔ یوں تو وقت اور ضرورت کے لحاظ سے موٹر کا کرایہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے لیکن عموماً لاری کا کرایہ فی سواری ۶ سے ۸ روپیہ تک ہے اور چار آدمیوں کو لے جانے والی ٹورنگ کار کم از کم ۷۵ روپیہ میں ہو جاتی ہے۔

ریل سے اتر کر اسٹیشن کے باہر آتے ہی سیکڑوں موٹر اور لاری والے چیونٹی کی طرح لپٹ جاتے ہیں یہ لوگ اس قدر چکنی چپڑی باتیں کرتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہر ایک شخص دھوکا کھا جاتا ہے۔ اس لئے موٹر اور کرایہ وغیرہ طے کرنے میں بہت ہی ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ اگر اچھی موٹر مل جائے اور اس کا کرایہ دوسری موٹروں سے کچھ زائد بھی ہو تو اُس کا خیال نہ کرنا چاہیئے کیونکہ ایسے پہاڑی ملکوں کا سفر کرنے میں ہر وقت جان کا خطرہ رہتا ہے۔

جو راستے راولپنڈی سے سری نگر جاتے ہیں ان میں سب سے اچھا اور محفوظ راستہ وہ ہے جو دریائے جہلم کی وادی میں ہوتا ہوا مرے، سے جاتا ہے۔ یہ راستہ سری نگر جا کر ختم نہیں ہوتا بلکہ اسلام آباد کے اور آگے تک چلا گیا ہے۔ اس راستہ سے سری نگر قریب ۲۰۰ میل کے پڑتا ہے۔ چند سال پیشتر جب موٹروں کا کشمیر میں گذر بھی نہ تھا اس وقت بھی لوگ اسی راستہ سے یکّوں اور تانگوں پر سفر کرتے تھے۔ موٹر کے مسافر اس راستہ سے زیادہ سے زیادہ تین دن میں سری نگر پہونچ جاتے ہیں۔

یکہ اور تانگہ کے رائج ہونے سے پہلے لوگ کشمیر کا سفر گھوڑوں اور خچروں پر کیا کرتے تھے۔ دوسرا راستہ جو راولپنڈی سے سری نگر جاتا ہے

وہ رتن پیر اور پیر پنجال کے درّون سے ہو کر گزرتا ہے رتن پیر کا درہ سطح سمندر سے تقریباً ۸۵۰۰ فٹ اور پیر پنجال کا درہ ۱۱۴۰۰ فٹ بلند ہے اگرچہ یہ راستہ بالکل پہاڑی ہے اور بہت دشوار گذار ہے مگر سری نگر کا فاصلہ اس راستہ سے صرف ۱۶۰ میل ہے لوگ اکثر تفریح کی غرض سے اس راستہ سے بھی جاتے ہیں جب پہاڑوں پر برف باری ہو جاتی ہے تو یہ راستہ بالکل مسدود ہو جاتا ہے۔

تیسرا راستہ راولپنڈی سے حسن ابدال۔ ایبٹ آباد۔ ہتیرا اور مظفر آباد ہوتا ہوا ڈومل کے مقام پر آکر پہلے راستہ سے مل جاتا ہے جس زمانہ میں برف باری ہو جانے کی وجہ سے مرے، کا راستہ بند ہو جاتا ہے اس وقت زیادہ تر لوگ اسی راستہ کو پسند کرتے ہیں۔ اس راستہ سے سری نگر ۲۲۵ میل ہے۔

چوتھا راستہ سیالکوٹ اور جموں ہوتا ہوا جاتا ہے۔ اس راستہ سے زیادہ تر شاہی خاندان کے لوگ سفر کرتے ہیں۔

راولپنڈی سے سری نگر تک کا سفر

کشمیر جانے والے راولپنڈی میں اتر کر رات بھر قیام کرتے ہیں۔ مسافروں کے آرام کے لئے یہاں علاوہ ہوٹلوں کے دھرم شالے اور سرائیں بھی ہیں دوسرے دن سورج نکلتے نکلتے موٹریں سری نگر روانہ ہو جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص تانگے پر سفر کرے تو اُس کی پہلی منزل براکو میں ہوتی ہے۔ یہ مقام راولپنڈی سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر ہے۔ راولپنڈی سے یہاں تک برابر سڑک پر دو رویہ شیشم کے سایہ دار درخت لگے ہوئے ہیں۔ براکو میں ایک بہت اچھا ڈاک بنگلہ مسافروں کے ٹھہرنے کے لئے بنا ہوا ہے۔ ڈاک بنگلہ کے بالکل سامنے پولیس کی چوکی ہے اور اس کے ہر چہار جانب ایک بہت وسیع میدان ہے جو فوجوں کے ٹھہرنے اور قواعد کرنے کے کام میں استعمال ہوتا ہے۔

راولپنڈی اور براکو کے درمیان میں دسویں میل پر ایک بہت مخدوش نالا ہے جو راول کے نام سے مشہور ہے۔ پرانے زمانے میں اس نالے میں بہت لوگ گر کر مر چکے ہیں چنانچہ جس زمانہ میں اس پر پختہ پل نہیں بنا تھا اس زمانہ میں دو انگریز ایک تانگے پر مرے سے راولپنڈی آرہے تھے۔ یہ لوگ شام ہوتے ہوئے مرے سے چلے تھے۔ نالہ پر پہونچتے پہونچتے

بالکل اندھیرا ہوگیا۔ نالہ بھرا دیکھ کر تانگے والے نے جانے سے انکار کیا۔ مگر ان دونوں مسافروں نے اس کو بہت مجبور کیا۔ وہ بیچارہ اسی خراب و خستہ پل پر سے تانگہ لیکر چلا۔ بیچ پل پر پہونچ کر دونوں مسافر بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اتر گئے۔ اترنے کے ساتھ ہی ایک لہر اس زور کی آئی کہ ان دونوں کو بہا کر لے گئی اور وہ دونوں مسافر ڈوب کر مر گئے۔ جب اس طرح کے کئی واقعات پیش آئے تو حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کی گئی۔ اب اس نالہ پر ایک بہت مضبوط اور پختہ پل بن گیا ہے اور کوئی خطرہ جان و مال کے ضائع ہونے کا نہیں ہے براکو سے روانہ ہونے کے بعد ایک میل تک برابر چڑھائی ہے۔ یہاں سے راستہ میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ملنی شروع ہو جاتی ہیں جن پر مختلف قسم کی خوبصورت جھاڑیاں اُگی ہوئی ہیں۔ ان جھاڑیوں میں رنگ برنگ کے پھول نکلتے ہیں۔ جب ہوا ان جھاڑیوں اور پھولوں سے ہو کر گذرتی ہے تو ان میں سے ایک خاص قسم کی بھینی بھینی خوشبو اڑ کر جانے والوں کا دماغ معطر کر دیتی ہے۔

راولپنڈی سے سترھویں میل پر ستارہ مل کی منزل ہے۔ یہاں پر ہر شخص کو ٹول ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ہر مسافر کو یہاں منزل کرنا ضروری ہے۔ موٹر کے مسافر یہاں کے چلے ہوئے سیدھے مرے میں ٹھہرتے

ہیں مگر تانگہ چھتر کی سرائے میں پہونچکر پھر منزل کرتا ہے۔ یہ سرائے ایک بہت پر فضا مقام پر واقع ہے بالکل سرائے کے سامنے ایک خوشنما اور گھنا باغ ہے جب پھلوں اور میووں کی پختگی کا زمانہ ہوتا ہے تو دوکاندار باغ سے پھل اور میوے توڑ کر سڑک کے کنارے آبیٹھتے ہیں اور آئندو روند کے ہاتھ اِن کو نفع کے ساتھ فروخت کر لیتے ہیں۔

سرائے بہت وسیع ہے اس میں متعدد کمرے ہیں یہاں پر مسافر اتر کر ناشتہ کرتے ہیں اور دو ایک گھنٹہ آرام اور باغ کی سیر کرنے کے بعد پھر روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس مقام سے پانچ میل کی چڑھائی کے بعد ٹرٹ کا ڈاک بنگلہ ملتا ہے۔ یہ مقام سطح سمندر سے ...۴ فٹ بلند ہے۔ یہ سب بنگلے گورنمنٹ نے مسافروں کے آرام و آسایش کے غرض سے بنوا دیے ہیں۔ ان بنگلوں کا ایک روپیہ یومیہ کے حساب سے کرایہ دینا پڑتا ہے ٹرٹ کے ڈاک بنگلہ کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان ہے جس میں وقتاً فوقتاً فوجین آکر قیام کرتی ہیں۔ میدان کے داہنی طرف تھوڑی سی آبادی ہے جس میں مختصر سا بازار اور ایک ڈاکخانہ ہے۔

ٹرٹ سے روانہ ہونے کے بعد دوسری منزل مرے میں ہوتی ہے۔ مرے کا شہر بالکل پہاڑی ہے یہ شہر سطح سمندر سے ...۶ فٹ بلند ہے۔

ٹرٹ سے لیکر یہاں تک سٹرک بہت خراب ہے لیکن راستہ میں بہت سے خوشنما باغ اور قدرتی مناظر دیکھنے میں آتے ہیں جس سے مسافروں کی طبیعت میں ماندگی نہیں پیدا ہوتی اور وہ راستہ کی تکلیفوں کو زیادہ محسوس نہیں کرتے۔ موٹر راولپنڈی سے مرے تک تین گھنٹے میں پہونچ جاتی ہے لیکن تانگے کو مرے پہونچنے میں عرصہ لگتا ہے۔ مرے کا شہر دو وجہوں سے بہت مشہور ہے ایک تو اس وجہ سے کہ یہ فوجی ہل اسٹیشن ہے اور راولپنڈی کے سرکاری افسر گرمیوں میں یہیں آکر رہتے ہیں دوسرے اس وجہ سے کہ یہاں شراب بہت کثرت سے بنتی ہے۔ انگریزی فوج کے لئے زیادہ تر بلکہ کل شراب یہیں سے خریدی جاتی ہے۔ ہل اسٹیشن ہونے کے باعث یہاں ڈاکخانہ کے علاوہ تارگھر بھی ہے۔ اگر کوئی شخص مرے میں قیام نہ کرے تو پھر اس کو سوائے کوہالہ کے اور کہیں آرام دہ جائے قیام نہیں مل سکتی۔

کوہالہ، مرے، سے ۲۷ میل ہے۔ یہاں سے کشمیر کی سرحد شروع ہوجاتی ہے۔ یہاں پہونچکر پھر ہر مسافر کو ایک روپیہ فی کس کے حساب سے ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ کوہالہ سے سری نگر تک برابر سٹرک دریائے جہلم کے کنارے کنارے گئی ہے۔ دریائے جہلم انگریزی عملداری اور ریاست کشمیر کے درمیان میں حد فاصل ہے جس پل کو پار کرکے مسافر

کشمیر کی سرحد میں داخل ہوتے ہیں اس کا آدھا حصہ انگریزوں کے قبضے میں ہے اور آدھا ریاست کشمیر کا ہے۔ کوہالہ سطح سمندر سے ۲۰۰۰ فٹ بلند ہے۔

کوہالہ سے ۲۰ میل آگے ڈومل کا مقام ملتا ہے۔ یہاں پر دریائے جہلم اور کشن گنگا کا سنگم ہے شاید اسی وجہ سے اس کا نام "دومیل" سے تبدیل ہو کر ڈومل ہو گیا ہے۔ جہلم کا پانی گندلا اور کشن گنگا کا پانی دھانی رنگ کا ہے ڈومل میں بیرونجات سے آنی والی چیزوں پر چنگی لگتی ہے۔ چنگی کی شرح مختلف ہے مختلف چیزوں پر سات سے لیکر تیس فیصدی تک چنگی لگتی ہے۔ ڈومل کا مقام بھی بہت پر فضا ہے۔ جگہ جگہ پر صاف وشفاف پانی کے چشمے آبشار اور نالے ملتے ہیں۔ درختوں پر مختلف قسم کی چڑیوں کے چہچہے اور آبشاروں کی سریلی آواز دل میں عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے کہیں دیودار اور سرو کے گھنے جنگل دکھلائی دیتے ہیں اور کہیں پہاڑ سے گرتے ہوئے پانی کے نیچے فرن کے چھوٹے چھوٹے درخت ہوا کے جھونکوں سے جھوم جھوم کر مسافر کے دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ڈومل سے سری نگر تک عجیب پر لطف منظر دکھائی دیتے ہیں جس طرف آنکھ اٹھتی ہے اسی طرف ایک نیا سمان نظر آتا ہے۔

شام ہوتے ہوتے موٹر اُڑی پہونچ جاتی ہے۔ یہاں سے لوگوں کو کچھ کچھ سردی بھی محسوس ہونی لگتی ہے اور ہوا کی لطافت روح میں تازگی اور جسم میں پھرتی پیدا کرتی ہے۔

راولپنڈی سے سری نگر تک کا سفر

جیسے جیسے آدمی کشمیر کی طرف بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کو آب و ہوا پیداوار اور ہر ایک چیز میں نمایاں فرق محسوس ہونے لگتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپریل کے مہینے میں کشمیر جائے تو پنجاب کے میدانوں میں اس کو گیہوں کے ہرے بھرے کھیت کثرت سے ملیں گے جن میں غلہ قریب تیاری کے ہوگا۔ اس سے آگے بڑھ کر ایسے کھیت ملیں گے جن میں ابھی صرف بالیاں ہونگی۔ اس سے اور آگے کے کھیتوں میں صرف گیہوں کے پودے نکلتے ہوئے دکھلائی دیں گے۔ اور آگے بڑھ کر صرف خالی کھیت ملیں گے جن میں کچھ بھی نہ بویا ہوگا۔

موٹر پر سفر کرنے والے ڈومل کے چلے ہوئے اُڑی میں آکر منزل کرتے ہیں لیکن تانگے کے مسافر بیچ میں چھوٹی کے مقام پر قیام کرتے ہیں۔ چھوٹی سطح سمندر سے ۳۷۸۰ فٹ بلند ہے۔ یہاں پر بھی اور

جگہوں کی طرح ڈاک بنگلہ بنا ہوا ہے۔ ڈومل سے چکھوٹی تک
قدرتی مناظر میں ایک خاص قسم کی شوخی ہے جس کو دیکھ کر طبیعت
انتہا سے زیادہ محظوظ ہوتی ہے۔ دریا بھی تنگ ہوتا چلا گیا ہے یہاں تک
کہ ایک مقام پر دریا کو عبور کرنے کے لئے پرانے زمانہ میں صرف ایک
رسیوں کا پل بنا دیا گیا تھا۔ اس پل کو دیکھ کر باہر سے آنیوالے مسافروں
کے دل میں خوف پیدا ہوتا تھا۔ لیکن کشمیر کے باشندے اس پل پر سے
بلا کسی خدشہ کے گذر جاتے تھے۔ زمانہ کی ضرورت کا اندازہ کرتے
ہوئے اس مقام پر بھی پختہ پل بن گیا ہے اور اب باہر والوں کو
کوئی دقت دریا کے پار کرنے میں نہیں ہوتی۔ چکھوٹی کا ڈاک بنگلہ
بالکل پہاڑی کے کنارے واقع ہے اس میں بیٹھ کر نیچے کا میدان
بہت صاف دکھلائی دیتا ہے۔

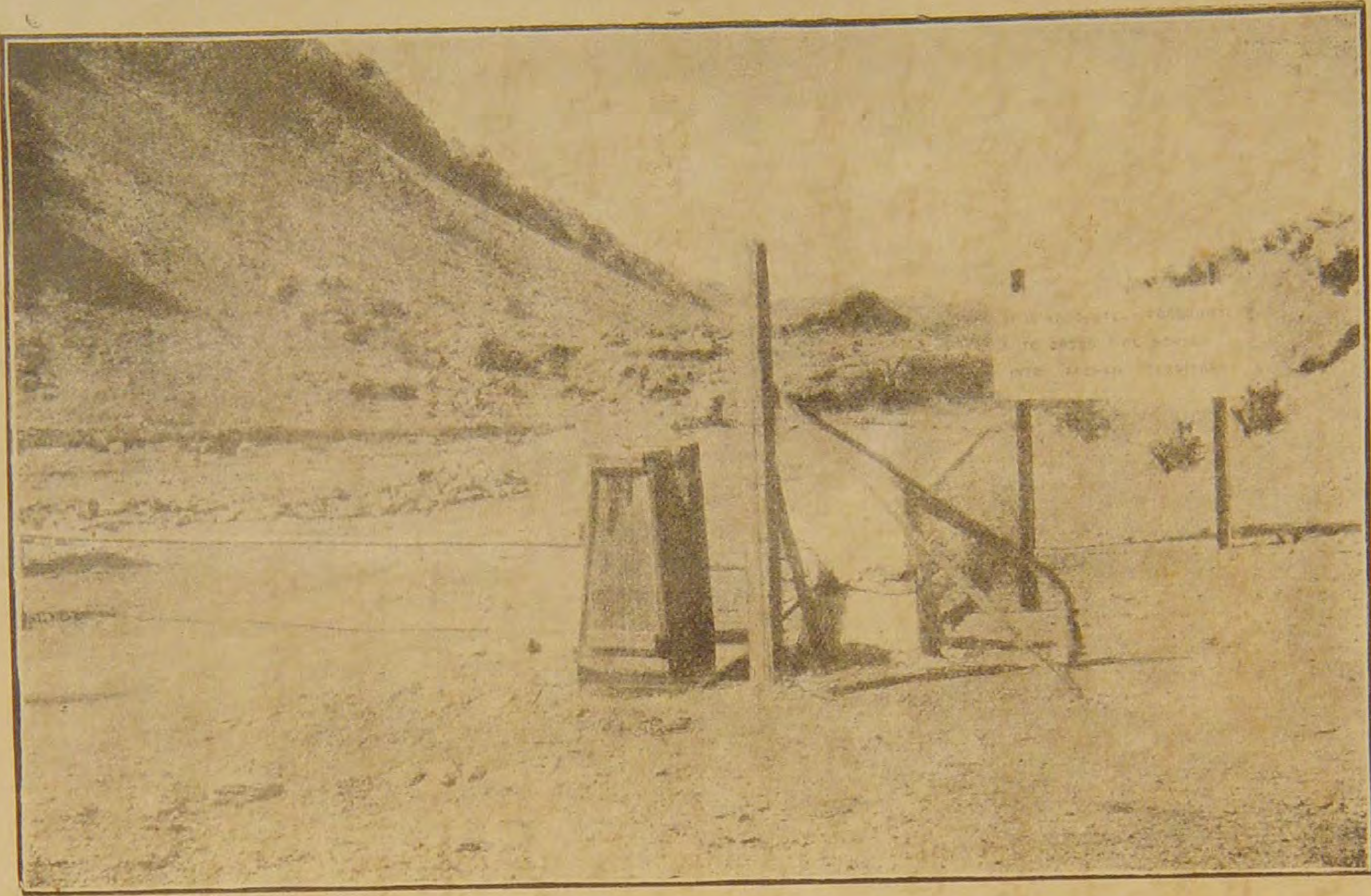
جو سڑک چکھوٹی سے اُڑی کو جاتی ہے وہ پہاڑ کو کاٹ کر بنائی گئی
ہے اس لئے سڑک کے ایک کنارے تو ہزاروں فٹ اونچے پہاڑ ہیں
اور دوسری طرف میلوں گہرے غار ہیں جن کی طرف محض دیکھنے سے چکر
آنے لگتا ہے۔ یہ سڑک بھی بہت زیادہ ناہموار اور جگہ جگہ پر ڈھلوان
ہے۔ اکثر بارش کے زمانہ میں بڑی بڑی چٹانیں پہاڑوں سے الگ ہو کر
سڑک پر آ رہتی ہیں۔ ان کی وجہ سے راستہ مسدود ہو جاتا ہے ان کے

ہٹانے میں بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔

اُری پہونچ کر ہوا میں خنکی محسوس ہونے لگتی ہے یہاں جیٹھ بیساکھ کے مہینے میں رات کو ماگھ پوس کی سی سردی ہوتی ہے۔ اُری سے صرف تھوڑی دور آگے تک پہاڑوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے اس کے بعد سری نگر تک زمین بالکل ہموار ہے۔

اُری سے آگے چل کر رام پور ملتا ہے۔ رام پور سطح سمندر سے ۴۸۲۵ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں دیودار کے گھنے جنگل اور ان کے آگے اونچی اونچی برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کی چوٹیوں کا منظر بہت دلکش ہے۔ سڑک انہیں دیودار کے جنگلوں سے ہو کر گذرتی ہے۔ ان جنگلوں کو پار کرنے پر چند پرانے مندروں کے کھنڈر ملتے ہیں۔ لوگ ان کو بارہ مت کے مندروں کے کھنڈر بتاتے ہیں۔ لیکن تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ یہ مندر بکرم سمبت کے چھٹویں صدی میں ہندوؤں نے تعمیر کئے تھے اور ان میں شیو کی پوجا ہوتی تھی۔ ان کھنڈروں کے دیکھنے سے اگلے بادشاہوں کی دولت و عظمت اور اس وقت کے لوگوں کی صناعی کا اندازہ ہوتا ہے۔

رام پور سے ملا ہوا ریاست کشمیر کا بجلی گھر ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ کہ اس جگہ دریا پہاڑوں میں سے ہوتا ہوا میدان میں گرتا ہے اس لئے یہاں پر



کشمیر سے افغانستان کی سرحد

اس کا دھارا بہت تیز ہے۔ اس کا فائدہ اٹھا کر انجینیروں نے یہاں پر بجلی کا کارخانہ بنا دیا ہے تاکہ برقی قوت پیدا کرنے میں کسی قسم کی دقت نہ محسوس ہو۔

بجلی گھر سے لیکر سری نگر تک سڑک پر دو رویہ سایہ دار درخت لگے ہوئے ہیں یہ درخت اس قدر نزدیک نزدیک لگائے گئے ہیں کہ سڑک کے دونوں طرف ایک سبز دیوار سی بن گئی ہے اس سبز دیوار میں سے دریا کا صاف پانی دھوپ میں چمک چمک کر لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہری بانات کے چادر پر روپہلے ستارے ٹانک دئے گئے ہیں۔ آدمی اس منظر کو دیکھکر اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ اور دوسری چیزوں کو یک لخت دل سے بھلا دیتا ہے۔

رام پور سے آگے بڑھ کر بارامولا کا پرانا قصبہ ہے۔ جیوں جیوں بارامولا قریب آتا جاتا ہے منظر کی دلفریبی بڑھتی جاتی ہے۔ ایک چوبی پل پار کرنے کے بعد سڑک بارامولا کی خاص آبادی میں داخل ہوتی ہے۔ بارامولا سطح سمندر سے ۵۱۵۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے دیکھنے سے تو اس قصبہ کے تمام مکانات بہت بوسیدہ معلوم ہوتے ہیں لیکن برسوں سے یہ اسی طرح کھڑے ہوئے ہیں اور بڑے سے بڑا زلزلہ انکی بنیادوں کو اب تک ہلا نہیں سکا۔ یہاں بھی ایک ڈاک بنگلہ دریا کے کنارے

مسافروں کے ٹھہرنے کے لئے بنا ہوا ہے بنگلے کے سامنے ہی گاڑی۔ تانگہ اور موٹروں کا اڈا ہے اور اسی سے ملا ہوا ڈاکخانہ اور تار گھر ہے۔
برامولا میں ریاست کشمیر کا ایک مہمان خانہ بھی ہے جو مہمان باہر سے مہاراجہ صاحب کی ملاقات کو آتے ہیں وہ اسی مہمان خانہ میں ٹھہرتے ہیں۔ اس مہمان خانہ کا کل خرچ شاہی خزانہ سے ہوتا ہے۔
برامولا میں غریبوں کے لئے ایک خیراتی اسپتال بھی ہے۔ دواخانہ سے قریب ہی برامولا کا مشہور پل ہے۔ یہ پل اس قدر مستحکم ہے کہ ۱۸۹۳ء کے سیلاب میں اسلام آباد تک کے سب پل ٹوٹ کر بہ گئے تھے لیکن یہ پل اپنی جگہ پر بدستور قائم رہا اور سیلاب کا اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔
ڈاک بنگلہ سے آدھے فرلانگ پر ایک چھوٹا سا پرانا احاطہ ہے۔ اس میں متعدد چنار کے درخت لگے ہوئے ہیں احاطہ کے اندر کوئی عمارت نہیں ہے بلکہ چاروں طرف پختہ روشیں بنی ہوئی ہیں اور بیچ میں ایک قبر ہے یہ ایک نوجوان انگریز انجینئر کی قبر ہے۔ یہ شخص ۱۸۹۰ء میں دریا میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ اس کے ڈوبنے کے بعد اس کی لاش دریا سے برآمد ہوئی اس کے خاندان والوں نے اس کی یادگار قائم رکھنے کے لئے یہ قبر بنائی اور باغ لگوا دیا۔
برامولا کی خاص آبادی کے اتر ایک میل پر اشکر امندر کے کھنڈر ہیں۔

یہ مندر سنہ ۲۳۳ء میں تعمیر ہوا تھا لیکن لوگوں کی بے توجہی اور امتداد زمانہ سے اب مسمار ہو گیا ہے۔

برامولا سے سری نگر تک سڑک پر دو رویہ نور جہاں کے لگائے ہوئے خاص قسم کے درخت ہیں۔ یہ درخت ہمیشہ سر سبز رہتے ہیں۔ بہار کے موسم میں اس درخت کی پتیاں عجب بہار دکھاتی ہیں۔ اس زمانہ میں کچھ پتیاں دھانی رنگ کی اور کچھ بالکل چاندی کی طرح سپید ہو جاتی ہیں جب ہوا چلتی ہے تو ان درختوں کی طرف دیکھنے میں بہت لطف آتا ہے۔ لیکن خزاں میں ان پتیوں کا رنگ ایک طرف تو زرد ہو کر سنہرے رنگ کا ہو جاتا ہے اور دوسری طرف بدستور سپید رہتا ہے۔ ہوا کے جھونکوں سے جب یہ گنگا جمنی پتیاں ہلتی ہیں تو اس وقت کی کیفیت لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ برامولا اور سری نگر کے بیچ میں ایک اور قصبہ پاٹن کا ہے۔ لیکن اس مقام پر کوئی خاص دلچسپی کا سامان نہیں ہے اس لئے لوگ یہاں بہت کم ٹھہرتے ہیں۔ ہاں پاٹن سے آگے بڑھ کر دو مندروں کے کھنڈر ہیں۔ ان مندروں کی ساخت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فن تعمیرات اس زمانے میں کس قدر ترقی پر تھا۔

کھنڈر کے پاس سے سڑک اک دم بائیں طرف گھوم جاتی ہے یہاں سے سری نگر کا شہر دکھلائی دینے لگتا ہے۔ تھوڑی دور آگے چل کر سڑک کے

دو حصّے ہو گئے ہیں۔ ایک سڑک تو خاص مہاراجہ صاحب کے محل کی طرف جاتی ہے اور دوسری سڑک جو بالکل دریا کے متوازی گئی ہے چاند ماری اور گھوڑ دوڑ کے میدان سے ہوتی ہوئی پل پر سے گذر کر سری نگر کی آبادی میں داخل ہوتی ہے۔ پل کی داہنی طرف فوج کے قواعد کا میدان اور بائیں جانب اسپتال اور قالین بننے کا ایک کارخانہ ہے۔

کشمیر کی قدیم تاریخ

پرانی کتابوں میں کشمیر کے بابت ایک عجیب افسانہ ملتا ہے جس کا بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا اس افسانہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مقام پر اس وقت کشمیر کی آبادی ہے وہاں پہلے ایک بہت بڑی جھیل تھی۔ اس جھیل کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے اور کسی شخص کا اس جھیل تک پہونچنا غیر ممکن تھا۔ یہ جھیل پربتی دیوی کی سیر گاہ تھی جو ہر ایک پہاڑ پر رہتی تھی۔ یہ دیوی بہت نیک اور رحمدل تھی۔ اس جھیل میں ایک بہت بڑا اژدھا بھی رہتا تھا جس سے ہر وقت نقصان پہونچنے کا اندیشہ تھا۔ ایک مرتبہ برہما کے پوتے کا ادھر سے گذر ہوا۔ اس نے اس اژدھے سے

مقابلہ کرنا چاہا۔ مگر وہ خوف کی وجہ سے جھیل میں چھپا رہا اور باہر نہ نکلا۔ اس پر اور دیوتاؤں کو غصہ آیا۔ انہوں نے برامولا کے مقام پر پہاڑ کو توڑ دیا۔ پہاڑ کے ٹوٹ جانے سے جھیل کا بہت زیادہ پانی بہ گیا اور بعض جگہ خشکی ظاہر ہو گئی۔ پھر بھی وہ اژدہا پانی میں چھپا بیٹھا رہا اور سامنے نہ آیا۔ اس وقت پربتی دیوی نے اپنے قلعہ سے ایک پہاڑ کا ٹکڑا اٹھا کر اس مقام پر پھینک دیا جہاں پر خیال تھا کہ اژدھا چھپا ہوا ہے۔ پہاڑ کا ٹکڑا گرنے سے اژدھا دب کر مر گیا۔ یہ پہاڑ اب تک ہے اسی کی چوٹی پر ہری پربت کا قلعہ بنا ہوا ہے۔

جب جھیل اس طرح پر خشک ہو گئی تو لوگوں نے آکر اس میں بود و باش شروع کر دی اور رفتہ رفتہ کشمیر کی سلطنت کی بنیاد پڑ گئی۔

یہ تمام واقعات اس وقت کے ہیں جس وقت فن تاریخ دنیا میں رائج نہیں ہوا تھا۔

کشمیر کی صحیح تاریخ کا پتہ اس وقت سے چلتا ہے جس وقت ہندوستان پر اشوک سلطنت کر رہا تھا۔ اشوک بدھ مذہب کا پیرو تھا۔ علاوہ الوالعزم بادشاہ ہونے کے وہ باہمت مبلغ بھی تھا اور جہاں جہاں ہو سکتا تھا وہ بدھ مت کی ترویج کے لئے مندر تعمیر کراتا تھا۔ اسی سلسلہ میں اسنے کشمیر کا بھی دورہ کیا لیکن اپنی عہد حکومت میں وہ وہاں کسی مندر کی بنیاد نہ ڈال سکا۔

سنہ ۔ء میں ایک شخص جس کا نام للتا دت تھا موقع پا کر کشمیر کا بادشاہ بن بیٹھا۔ یہ بادشاہ بہت رعایا پرور تھا۔ اس نے اپنی رعایا کے آرام و آسائش کے لئے متعدد نہریں۔ اور پل وغیرہ بنوائے اور رفتہ رفتہ شہر آباد کرنے شروع کیئے اندرونی ترقی کے علاوہ سلطنت کو وسیع کرنے کے لئے اس نے دوسرے ملکوں پر بھی حملہ کیا اور جو جو چیزیں اس سے ممکن ہوئیں وہ اپنی رعایا کی بہبودی کے لئے ان ملکوں سے لے آیا۔ جب کبھی وہ کسی ملک کو فتح کرتا تھا تو وہاں سے بڑے بڑے ہوشیار کاریگر اور عالم و فاضل لوگوں کو اپنے ساتھ لے آتا تھا تاکہ وہ عام رعایا کی تعلیم و تربیت کے لئے نئے نئے راستے نکالیں۔ اور جو سونا اور روپیہ پیسہ لوٹ میں پاتا تھا اس سے وہ بڑے بڑے مندر تعمیر کراتا تھا۔ مرتند کا مندر جو اس وقت تک موجود ہے اسی کے عہد کی یادگار ہے۔

للتا دت کے زمانہ میں کشمیر کے باشندوں نے خوب ترقی کی اور اپنی ضرورت کی چیزیں خود بنانے اور پیدا کرنے لگے اس وقت سے یہ ملک اپنی ضروریات زندگی کے لئے دوسرے ملکوں کا محتاج نہیں رہا۔

اس بادشاہ نے اپنے ملک کی ایک فوج بھی تیار کی تھی۔ اس میں ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہر ایک کام میں اپنی رعایا کے واسطے

نمونہ بننے کے لئے خود تیار ہو جاتا تھا اور جس بات کو وہ دوسروں سے کرانا چاہتا تھا۔ پہلے خود اس کو کرکے دکھا دیتا تھا۔ اسنے اپنے تمام قلعوں میں رسد رسانی کا کافی انتظام کر دیا تھا۔ دوسرے ملکوں پر حملہ کرنے سے اس کو یہ سبق ملا تھا کہ ہمیشہ اپنے سپاہیوں کو دانہ پانی سے سیر و سیراب رکھنا چاہیئے چنانچہ لڑائی کے موقعوں پر علاوہ روزانہ رسد کے ہمیشہ زائد غلہ اتفاقی ضرورت کے لئے موجود رہتا تھا۔

وہ کبھی اپنی فوج کو بیکار نہیں بیٹھنے دیتا تھا بلکہ ہمیشہ ان کو کسی نہ کسی مہم پر بھیجتا رہتا تھا تاکہ وہ کاہل نہ ہو جائیں اس کے فوج میں ۶ ہزار سوار اور تقریباً پچاس ہزار پیدل ملازم تھے۔

لالتادت کے آنکھ بند ہوتے ہی زمانہ پلٹ گیا اور وہی فوجی افسران جو ایک زمانہ میں امن وامان کا باعث ہوئے تھے آپس میں خانہ جنگیاں کرنے لگے۔ دو سو برس تک ملک کی یہ حالت تھی کہ جان و مال محفوظ نہیں تھے۔

دو سو برس کے خانہ جنگیوں کے بعد اونتی ورمانے اپنی سلطنت قائم کی۔ یہ شخص کسی شاہی خاندان سے نہ تھا بلکہ محض ایک انجینیر تھا۔ لوگوں کی یہ حالت تباہ دیکھکر اور موقع پا کر اسنے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا اور تھوڑے ہی عرصہ کی حکومت کے بعد ان خانہ جنگیوں

کی مکمل طور پر بیخ کنی کر دی۔

اس کے انتقال کے بعد اس کے خاندان کے دو تین بادشاہ اور ہوئے مگر وہ سب اپنی بدنظمی اور عیش پرستی کی وجہ سے بہت جلد قتل کر دئے گئے اور ایک مرتبہ پھر تمام کشمیر میں ظلم و جور کا دورہ ہوا۔

آپس کی نا اتفاقی اور خانہ جنگیوں کی خبر پا کر چودھویں صدی میں میر شاہ نے کشمیر پر حملہ کیا اور رانی کوٹا کو جو اس وقت برسر اقتدار تھی تخت سے اُتار کر خود بادشاہ بن بیٹھا۔ اس وقت سے مسلمانوں کے حکومت کی بنیاد کشمیر میں پڑی۔ میر شاہ اور اس کے بعد کے بادشاہوں نے سوائے ذوالقدر خاں اور سکندر کے اپنی رعایا کے ساتھ بہت رواداری کا برتاؤ کیا۔ حتیٰ کہ سرکاری زبان بھی سنسکرت ہی رکھی گئی ہندو برہمن بدستور سابق برسر اقتدار رہے اور انتظامی معاملات میں مشورہ دیتے تھے۔

۱۴۱۷ء میں ایک شخص زین العابدین نامی کشمیر کا بادشاہ ہوا۔ اس نے اپنے رہنے کے لئے کشمیر میں بارہ منزل کا ایک محل بنوایا جس میں بہت بڑے بڑے کمرے تھے۔ اس نے رعایا کے ساتھ کبھی تعصب کا برتاؤ نہیں کیا بلکہ جو ہندو اور بدھ مذہب کے مندر دوسرے بادشاہوں نے گروا دئے تھے اس نے ان کی مرمت کرا دی۔

اس نے بڑے امن و چین اور عدل و انصاف کے ساتھ ۴۲ برس تک حکومت کی۔ اور کچھ تھوڑا سا حصہ پنجاب کا بھی فتح کر کے کشمیر کی سلطنت میں شامل کر دیا۔ اس نے ایک بات ضرور کی وہ یہ کہ ضرورت سے مجبور ہو کر اس نے سرکاری زبان فارسی کر دی اور ہر ایک عہدہ دار کے لئے فارسی کا جاننا لازم قرار دے دیا۔

زین العابدین کے بعد جو لوگ تخت پر متمکن ہوئے وہ بہت ظالم و جابر تھے۔ اس لئے ان کی سلطنت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ اور ملک کی حالت بلا کسی رعایا پرور بادشاہ یا سردار کے حد سے زیادہ خراب ہو گئی۔

سنہ ۱۵۳۲ء میں ایک سرحدی قبیلے کے سردار مرزا حیدر نے کشمیر پر حملہ کیا۔ لوگوں کی حالت غیر ہونے کی وجہ سے اس کو کشمیر فتح کرنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی چنانچہ مرزا حیدر اور اس کے خاندان والے سنہ ۱۵۸۶ء تک کشمیر پر حکومت کرتے رہے۔

سنہ ۱۵۸۶ء میں اکبر نے اس قبیلے کو زیر کر کے کشمیر کو اپنی وسیع سلطنت کا ایک حصہ قرار دیا اور لوگ پھر عیش و عشرت سے زندگی بسر کرنے لگے۔ اکبر کی رواداری ضرب المثل ہے

سلطنت کا ایک حصہ ہونے کی وجہ سے کشمیر میں بھی اس نے اسی رواداری سے کام لیا اور ہری پت کا قلعہ تعمیر کرا دیا۔ اس رواداری کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ جان و مال کے خوف سے ملک چھوڑ کر بھاگ گئے تھے پھر واپس آ گئے اور اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگے۔

اکبر کے بعد جہانگیر اور شاہجہاں نے کشمیر کی طرف خاص توجہ کی اور بہت سے خوبصورت باغ اور عمارتیں تعمیر کرائیں جن میں سے چند آج تک یادگار ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ مغل بادشاہوں کے زمانہ میں قریب قریب ۷۰۰ باغ کشمیر میں لگائے گئے تھے۔

جب اورنگ زیب تخت پر بیٹھا تو وہ شاہی عاطفت جو اور بادشاہوں کے زمانہ میں کشمیر کو حاصل تھی قائم نہ رہی جس کی وجہ سے ایک بار پھر لوگوں میں بے اطمینانی پھیلنی شروع ہو گئی۔ مگر محض اس ایک واقعہ سے کشمیر مغل بادشاہوں کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا کیونکہ بہت سی چیزیں از قسم بندوبست و مالگذاری وغیرہ انہیں مغل بادشاہوں نے کشمیر میں جاری کی تھیں جن پر آج تک اصولی لحاظ سے عمل درآمد ہوتا چلا آتا ہے۔

مغل بادشاہوں کا اثر کم ہونے کے ساتھ ہی ۱۷۵۲ء میں

افغانوں نے کشمیر کو فتح کر کے اس پر اپنا قبضہ جما لیا اور ان لوگوں نے رعایا کے آرام و اطمینان کو اپنی ذاتی اغراض پر ترجیح نہ دی اسی وجہ سے ان کی سلطنت کامیاب نہیں رہی۔ ان لوگوں نے نہ تو عہد مغلیہ کی قدیم یادگاروں کی کچھ قدر کی اور نہ ان کی شکست و ریخت کے مرمت کی طرف توجہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی قابل دید قدیم یادگاریں تباہ و برباد ہو گئیں۔

افغان بادشاہوں میں بھی کچھ ایسے کمزور بادشاہ ہوئے کہ سلطنت کا انتظام مناسب طور پر نہ کر سکے چنانچہ مسلمانوں کی سلطنت معرض زوال میں آگئی۔

لوگوں کی ابتر حالت اور افغان بادشاہوں کی کمزوریوں کا اندازہ کر کے پنجاب کے راجہ رنجیت سنگھ نے گلاب سنگھ والئ جموں کے مدد سے ۱۸۱۹ء میں کشمیر پر حملہ کیا اور فتح کر کے اسکو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ پنجاب کی سلطنت میں شامل ہوتے ہی سکھوں کا اثر کشمیر میں روز بروز بڑھنے لگا یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصے میں سکھ پورے طور پر کشمیر پر قابض و متصرف ہو گئے۔ سکھوں نے اپنی منفعت کا زیادہ خیال کیا اور رعایا کی بہبودی کی طرف توجہ نہ کی۔ اور نہ ان کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا۔ انہوں نے ہر ایک تجارتی مال پر جو

وہاں بنایا جاتا تھا ٹیکس لگا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر کی صنعت وحرفت کو نقصان پہونچا اور لوگوں نے مجبور ہو کر رفتہ رفتہ ان چیزوں کا بنانا چھوڑ دیا۔ جہاں تک ممکن تھا سکھوں نے عام رعایا سے اپنے فائدے کے لئے روپیہ پیسہ حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ انیسویں صدی میں جن غیر ملکی سیاحوں نے کشمیر کی سیر کی ہے ان کی تحریروں سے ان تمام باتوں کا کافی ثبوت ملتا ہے۔

جب انگریزوں نے پنجاب میں اپنا قبضہ جمانا شروع کیا تو کشمیر میں بھی سکھوں کا اثر کم اور انگریزی اثر بڑھنے لگا گلاب سنگھ والئی جموں نے پنجاب فتح کرنے میں انگریزوں کی بہت زیادہ مدد کی تھی اس کارگذاری کے صلہ میں انگریزوں نے کشمیر کی سلطنت امرتسر کے صلحنامہ کے مطابق ۱۸۴۶ء میں ۷۵ لاکھ روپیہ لیکر گلاب سنگھ کو دے دی۔ اس وقت سے یہ سلطنت انہیں کے خاندان میں چلی آتی ہے۔

کشمیر میں ڈوگرا راجپوتوں کی سلطنت

ڈوگرا راجپوتوں کی سلطنت کشمیر میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے تخت نشینی سے شروع ہوتی ہے یوں تو ۱۸۲۲ء میں خود مہاراجہ رنجیت سنگھ نے گلاب سنگھ کو جموں کی گدی پر بٹھلایا تھا لیکن کشمیر کی سلطنت ان کو ۱۸۴۶ء میں امرتسر کے صلحنامہ کے مطابق ۷۵ لاکھ روپیہ دینے پر انگریزوں سے مل گئی۔

جس وقت مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر کی عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لی اس وقت وہاں کے لوگوں کی حالت بہت ابتر تھی۔ گورنمنٹ کاشتکاروں سے پیداوار کا دو تہائی بلکہ تین چوتھائی تک لے لیتی تھی ان بیچاروں کے پاس کھانے تک کو غلہ نہیں بچتا تھا۔ سرکاری عملے غریب کاشتکاروں کو جی بھر کر لوٹتے اور ستاتے تھے مگر ان کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا تھا۔ اگرچہ مہاراجہ گلاب سنگھ اپنی سلطنت کے مالک کامل تھے پھر بھی وہ رعایا کے حالت کو کافی طور پر درست نہ کر سکے۔ اتنا ضرور ہو گیا کہ ہر شخص کے ساتھ رواداری اور مروت کا برتاؤ ہونے لگا اور ہر قوم اور ہر ملت کو کامل طور پر مذہبی آزادی حاصل ہو گئی۔ مہاراجہ صاحب ہر وقت غریبوں کی فریاد

سننے اور ان کی دادرسی کے لیئے تیار رہتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ لوگوں کی بے اطمینانی دور ہونے لگی۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کے انتقال کے بعد ان کے لڑکے مہاراجہ رنبیر سنگھ ۱۸۵۷ء میں تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے اپنی رعایا کی حالت درست کرنے کی انتہائی کوشش کی جفاکش اور ایماندار افسروں کے نہ ہونے سے اگرچہ اُن کو اپنے اس ارادہ میں پوری کامیابی حاصل نہیں ہوئی مگر پھر بھی وہ ناامید نہیں ہوئے اور برابر تدبیریں سوچتے رہے جب ان کا زمانہ سلطنت ختم ہونے پر آیا تو ان کے مدتوں کی کوششوں کا نتیجہ حسب دلخواہ نظر آنے لگا مثلاً ہر قسم کے جرائم میں انتہا سے زیادہ کمی ہوگئی سرکاری مالگذاری کا بھی بندوبست ہو گیا اور ایک معین رقم ہر سال کے مالگذاری کی مقرر ہو گئی۔ ۵۰۰۰۰ روپیہ سالانہ رعایا کے تعلیمی اخراجات کے لیئے منظور کیا گیا۔ سڑکیں اور راستے کافی روپیہ لگا کر درست کرائے گئے ان تمام باتوں سے رعایا کو اور بھی تقویت حاصل ہوگئی اور وہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگے ایک بات کا یہاں پر ذکر کر دینا خالی از لطف نہ ہوگا۔ وہ یہ کہ جب انگریزوں نے گلاب سنگھ کو کشمیر کی سلطنت امرتسر کے صلحنامہ کے مطابق دی تو ان کو اس کا مالک کامل بنا دیا اور اندرونی معاملات

سے ان کو کوئی سروکار نہ رہ گیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد سلطنت میں انگریزوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اور ریاستوں کی طرح کشمیر میں بھی ایک انگریز پولٹیکل افسر کی حیثیت سے مقرر ہو جائے۔ لیکن مہاراجہ صاحب نے ان لوگوں کا یہ ارادہ دیکھکر اس کی سخت مخالفت کی اور اپنے جیتے جی انگریزوں کا ارادہ پورا نہ ہونے دیا۔

۱۸۸۵ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کا انتقال ہو گیا اور مہاراجہ پرتاب سنگھ گدّی پر بیٹھے۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ کا شمار کمزور راجاؤں میں ہوتا ہے۔

ان کی کمزوری کا فائدہ اُٹھا کر انگریزوں نے کشمیر میں ایک پولیٹکل افسر مقرر کر دیا۔ اس وقت سے برابر یہ افسر کشمیر میں رہنے لگا۔ ان کی کمزوری کی ایک بیّن مثال یہ ہے کہ تین چار برس سلطنت کرنے کے بعد مہاراجہ پرتاب سنگھ نے گدّی چھوڑ دی اور ایک کونسل بنا کر اپنے بھائی راجہ امر سنگھ کو اس کا صدر بنا دیا۔ راجہ امر سنگھ ۱۸۸۹ء سے ۱۸۹۱ء تک اس کونسل کے پریسیڈنٹ رہے۔ وہاں سے علیحدہ ہونے کے بعد آپ ۱۹۰۷ء تک ریاست کے وزیر اعظم اور فوج کے اعلیٰ افسر رہے۔ ۱۸۹۱ء میں خود مہاراجہ پرتاب سنگھ اس کونسل کے پریسیڈنٹ ہو گئے۔ ۱۹۰۵ء میں راجہ صاحب کو کچھ تھوڑے بہت اختیارات دیئے گئے اور کونسل توڑ کر وہ پھر گدی پر بیٹھے ۱۵ برس تک

انہیں اختیارات کے ماتحت آپ کام کرتے رہے ۱۹۲۱ء میں ان کو
از سر نو اختیارات کلی عطا ہوگئے اور ایک مرتبہ پھر وہ خود مختار ہو کر حکومت
کرنے لگے۔ لیکن اس درمیان میں انگریزی اثر اور خود مہاراجہ صاحب
کی اصلاح پسند طبیعت دونوں نے ملکر ریاست کی حالت بہت درست
کر دی۔ چنانچہ مالگذاری کا از سر نو بندوبست ہوا جس میں رعایا اور
کاشتکاروں کے حقوق کا بہت زیادہ تحفظ کیا گیا۔ ملک کی زراعت
کو ترقی دینے کے لئے ایک زراعتی شعبہ کھولا گیا اور مختلف مقامات
پر کو آپریٹو سوسائٹی قائم کی گئی۔ قواعد تعلیم بھی پھر سے درست
کئے گئے۔ دو اعلیٰ درجہ کے کالج اور ایک (ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ)
کھول دیا گیا۔ بڑے بڑے شہروں میں اسپتال اور خاص خاص
موضعوں میں انگریزی دواخانے بیماروں کے علاج کے لئے قائم
کر دئے گئے۔ خاص خاص سڑکوں اور راستوں کی بھی مرمت کرائی
گئی تاکہ لوگوں کو آنے جانے میں تکلیف نہ ہو۔ سری نگر اور جموں میں
میونسپلٹی قائم ہوگئی اس طرح رعایا کو خود اختیاری سلطنت کی تعلیم
بھی رفتہ رفتہ دی جانے لگی۔ جموں میں کاشتکاروں کے آسانی کے لئے
نہریں بنوادی گئیں۔ چنانچہ اس وقت ۱۳۵۴۵۰ ایکڑ زمین کی ان
نہروں سے آبپاشی ہوتی ہے۔ خود ریاست کے قوانین میں اصلاح کی گئی



مہاراجہ صاحب سرهري سنگهه والئے کشمیر

اور ان کی بنا انگریزی اصول پر رکھی گئی۔ ریاست میں چیچک کی بیماری بہت پھیلا کرتی تھی جس سے سیکڑوں جانیں ہر سال ضائع ہوتی تھیں اس شکایت کو دور کرنے کے لئے ٹیکہ لگایا جانے لگا اور جموّں اور سری نگر میں پانی کے نل لگا دئے گئے تاکہ ہیضہ کے پھیلنے میں یک گونہ کمی ہو جائے۔ عدالتوں کے حکام مجلس انتظامیہ کی ماتحتی سے نکال کر خود مختار کر دئے گئے۔ جو زائد ٹیکس وقتاً فوقتاً لوگوں پر لگائے گئے تھے وہ بھی مسترد کر دئے گئے۔ دوشالوں کا بنانا اور دوسری قسم کی صنعت وحرفت جو اب تک صرف ریاست کے لئے مخصوص تھیں عام کر دی گئیں ہر شخص کو ان چیزوں کے بنانے اور فروخت کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ غرض یہ کہ اسی طرح کی اور بہت سے رعایتیں رعایا کے حق میں کی گئیں جن سے ان کی حالت روز بروز درست ہوتی گئی۔

مہاراجہ پرتاب سنگھ کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے ۱۹۲۵ء میں ان کے انتقال کے بعد راجہ امر سنگھ کے لڑکے مہاراجہ سر ہری سنگھ موجودہ فرمانروائے کشمیر گدّی پر بیٹھے۔

گدّی پر بیٹھنے سے پہلے ہی مہاراجہ صاحب نے ملکی انتظام میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنیکے

بعد ۱۹۱۵ء میں آپ ۲۰ برس کی عمر میں ریاست کے اعلیٰ فوجی افسر ہو گئے۔ اس عہدہ پر رہ کر آپ نے فوج کی حد سے زیادہ اصلاح کی اور ان کے قواعد کے طریقوں اور تعلیم میں روز بروز ترقی ہوتی گئی۔

۱۹۲۱ء میں آپ آئینی کونسل کے اعلیٰ ممبر مقرر ہوئے۔

۱۹۲۶ء میں گدّی پر بیٹھنے کے بعد آپ نے رفتہ رفتہ انگریزی اثر کو جو روز بروز بڑھتا جاتا تھا کم کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے باہری لوگوں کو علحدہ کر کے خود ریاست کے لوگوں کو بڑے اور ذمہ دار عہدوں پر مامور کیا اور اُردو زبان کو بدل کر انگریزی کو عدالتی زبان قرار دیا۔

اس خیال سے کہ ریاست کو کسی وقت میں حکام کی کمی محسوس نہ کرنی پڑے مہاراجہ صاحب نے ایک لاکھ روپیہ کا سالانہ وظیفہ اس بات کے لئے مقرر کر دیا ہے کہ ہر سال ان کے ریاست سے لوگ انتظامی امور سیکھنے کے لئے یورپ اور انگلینڈ بھیجے جایا کریں۔ چنانچہ اس وقت سے لوگ برابر ہر سال انتظامی امور سیکھنے کے لئے باہر جاتے ہیں اس وظیفہ کو مسلمانوں اور ہندوؤں پر آدھا آدھا تقسیم کر دیا گیا ہے۔

رعایا کی مالی حالت درست کرنے کے خیال سے ایک بنک بھی

کھولا گیا ہے۔ اس کا کل سرمایہ ۵۰ لاکھ روپیہ ہے اس میں سے آدھا ریاست نے دیا ہے اور آدھا روپیہ ریاست کے باشندے حصّہ خرید کر دینگے۔ اس بنک میں سوائے مقامی لوگوں کے اور کوئی باہر والا حصّہ دار یا ڈائرکٹر نہیں ہو سکتا۔ تمام سرکاری محکموں اور ملازموں کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ اپنا روپیہ اس بنک میں جمع کیا کریں۔

مختصر یہ کہ مہاراجہ گلاب سنگھ سے لے کر موجودہ فرمانروائے کشمیر تک کے اصلاحات کا اندازہ کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ڈوگرا راجپوتوں کی سلطنت ریاست کشمیر کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ اس لئے وہاں کی رعایا کو قعر گمنامی سے نکالنے اور تہذیب و ترقی کے اعلیٰ زینہ پر پہونچانے کی کوشش کی ہے۔

اس زمانہ میں جبکہ ہر قوم کو اپنے سیاسی اقتدار اور ملی وقار کے قائم کرنے کا خیال پیدا ہو گیا ہے ریاست کشمیر کے باشندوں میں بھی ترقی کا احساس اگر پیدا ہوا تو بیجا نہیں۔ مسلمان جو کہ یہاں کثرت تعداد میں آباد ہیں اور جنکی اقتصادی حالت خراب ہے اپنی فلاکت اور تکلیف وہ مفلسی سے تنگ آکر حکومت کو اپنی حالت سقیم کی طرف توجہ دلانے کے خواہشمند ہوئے۔ ایسے حضرات جو نام و نمود اور

ذاتی منفعت کا ذریعہ تلاش کیا کرتے ہیں قریب قریب ہر جگہ موجود ہیں۔ان حضرات کی جدوجہد اور مسلمانان کشمیر کی اقتصادی حالت درست کرنے کی خواہش نے ایسی صورتیں اختیار کیں کہ یہ جنت نظیر خطہ نمونہ سقر بن گیا۔رعایا میں جو بے امنی پھیلی اور حکومت کو ان کے اصلاح و درستی کے لئے جو پریشانی اُٹھانی پڑی وہ محتاج تحریر نہیں۔امید ہے کہ سر ہری سنگھ سے بیدار مغز مہاراجہ کے عہد میں یہ شورشیں رعایا کی بہبود اور ترقی کو مدنظر رکھکر بوجوہ احسن فرو ہو جائیں گی۔

سری نگر اور وہاں کے باشندوں کی عام حالت

جو لوگ گرمیوں میں کشمیر کی سیر کو جایا کرتے ہیں ان سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ بہ نسبت پہلے کے اب کشمیری بہت زیادہ تہذیب یافتہ ہو گئے ہیں صنعت و حرفت و تجارت میں انہوں نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔اسکی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ ہندوستان یا اور دوسرے ملکوں سے تفریح طبع کے لئے یہاں آتے ہیں وہ عمدہ عمدہ چیزیں خریدنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔چونکہ چیزوں کی مانگ زیادہ رہتی ہے اس لئے لوگ چیزیں بناتے ہیں۔اور جیسے ہی چیزیں تیار ہوئیں

وہ فوراً بک بھی جاتی ہیں۔ اس فروخت کی وجہ سے لوگوں کی ہمّت بڑھتی ہے اور وہ چیزوں کے بنانے میں جان توڑکر کوشش کرتے ہیں اوراس کو عمدہ سے عمدہ بناتے ہیں۔

علاوہ اس کے باہر سے آئے والوں کی راست بازی۔ اخلاق اور انسانیت اور امریکن مبلغوں کی مستعدی وہاں کے باشندوں کو رفتہ رفتہ اخلاقی تعلیم کا سبق دے رہی ہیں۔ اب وہاں کے عام باشندوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ سچے آدمی کے لئے خوشامد بوداپن اور جھوٹ بولنا کسی طرح زیبا نہیں ہے۔ ہر فرد بشر کو سب کاموں میں مستعد رہنا چاہیئے اور کسی موقع پر ہمت اور استقلال کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔ چونکہ ان لوگوں کو آئے دن غیر ملک کے سیاحوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے اس لئے قریب قریب یہ سب باتیں کشمیریوں کے اخلاق و عادات میں داخل ہو گئی ہیں ان تمام باتوں کے علاوہ جس چیز نے کشمیریوں کو ترقی کرنے کا موقع دیا وہ مہاراجہ صاحب کی توجہ ہے۔ وہ اپنی رعایا کی بہبودی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ انہوں نے ریاست کے خرچ سے بہت سے اسپتال وشفاخانے اور دوسری ضروری عمارات ملک بھر میں تعمیر کرادی ہیں تاکہ رعایا کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو

سری نگر کو تو انہوں نے جنت کا نمونہ بنا دیا ہے۔ کل شہر بہت دلفریب اور عالیشان ہے۔ شہر کی خوبصورتی اور دلکشی میں اس وجہ سے اور بھی اضافہ ہو گیا ہے کہ دریائے جہلم بالکل شہر کے اندر سے ہو کر بہتا ہے اس کے دونوں کناروں پر عمدہ اور عالیشان مکانات بنے ہوئے ہیں۔ سری نگر کے دو حصوں کو آپس میں ملانے کے لئے دریا پر جابجا پل بنا دئے گئے ہیں۔ ان کے اوپر پکّی سڑکیں ہیں جو شہر کی شاہراہ ہیں۔ لیکن ان سڑکوں پر زیادہ آمد و رفت نہیں ہوتی کیونکہ زیادہ تر لوگ کشتیوں پر چلتے ہیں۔

کشمیری زبان میں پل کو کدل کہتے ہیں سری نگر کے پلوں کے نام مسلمان حکمرانوں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ ایک پل فتح خاں کے نام پر دوسرا زین العابدین تیسرا پل اس کے لڑکے علی خاں کے نام سے موسوم ہیں دو اور پل سیف اللہ اور نور الدین کے نام پر معنون ہیں پہلے ان پلوں پر دونوں طرف دوکانیں تھیں لیکن اب یہ دوکانیں توڑ دی گئی ہیں۔

کشمیر میں مکانات اگرچہ لکڑی اور کچّی اینٹ سے بنائے جاتے ہیں پھر بھی وہ پکّے مکانوں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں اور سخت سے سخت زلزلے میں بھی ان کو جنبش نہیں ہوتی۔

وہ جگہ جہاں پر شہر آباد ہے آب و ہوا کی لحاظ سے بہت اچھی ہے لیکن شہر کی سڑکیں اور گلیاں بہت گندی رہتی ہیں اس کے علاوہ شہر کے نابدانوں اور دریا کے پانی میں بدبو پیدا ہوجانے سے آب و ہوا اکثر خراب ہوجاتی ہے جس سے بیماری پھیلتی ہے۔ شہر کی دلکشی اور دلفریبی ان بے عنوانیوں کا بدل ہوجاتی ہے جو آب و ہوا کی خرابی سے وقتاً فوقتاً پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

سری نگر کے دلکشی کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ شہر میں ایک ہی جگہ پر انواع و اقسام کی عمارتیں جمع ہوگئیں ہیں مثلاً ایک جگہ پر ہندوؤں کا مندر ہے تو اسی جگہ پر دو چار قدم کے فاصلہ سے مسلمانوں کی مسجد بھی ہے اگر کہیں پر عالیشان مکانات ہیں تو اسی کے برابر بڑی بڑی دوکانیں ہیں اور ساتھ ہی ساتھ چھپر پڑے ہوئے جھونپڑے بھی ہیں۔ بڑے مکانوں میں محراب دار دروازے اور کھڑکیاں لگی ہوتی ہیں ان دروازوں میں بجائے پردوں اور چقوں کے رنگ برنگ کے شالی پردے پڑے رہتے ہیں بہار کے دنوں میں ان مکانات کی خوبصورتی دوبالا ہوجاتی ہے کیونکہ اس زمانہ میں ہر کوچہ و بازار میں انگور اور لالہ کی بیلیں مکانوں

اور دو کانوں پر چڑھا دی جاتی ہیں۔ جس وقت ان بیلوں میں پھول آتے ہیں تو کل شہر دولہن کی طرح سج جاتا ہے۔

علاوہ اندرونی دلکشی کے سری نگر کے ہر چہار جانب کا منظر بھی قابل دید ہے اگر کوئی شخص تخت سلیمان کی چوٹی پر جائے اور وہاں سے سری نگر کی طرف نظر کرے تو شہر کے آس پاس کی چراگاہیں اور دھان کے کھیت بالکل ایک دوسرے سے اس طرح پر ملے ہوئے ہیں کہ شطرنج کے بساط کا خانہ معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں کھیتوں اور چراگاہوں کے بیچ بیچ میں جابجا صاف پانی کے چشمے بھی جاری ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہری چادریں روپہلی گوٹ لگا کر زمین پر بچھا دی گئی ہیں۔ ان کھیتوں سے تھوڑی دور آگے بڑی بڑی جھیلیں ہیں جس کے پانی میں پہاڑوں کا عکس پڑ کے ان تمام منظروں کی دلکشی کو اور بھی دوبالا کر دیتا ہے۔

کشمیر کے باشندے بہت نازک مزاج ہوتے ہیں۔ بہ نسبت اور ملکوں کے یہاں کے لوگوں کا رنگ سردی کی وجہ سے زیادہ صاف ہوتا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ پہاڑی ملکوں کے لوگ عموماً بہت محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں مگر کشمیر کے باشندوں میں ہمت و استقلال بہ نسبت اور پہاڑی ملکوں کے کم پایا جاتا ہے۔

یہاں کے لوگ معمولی سے معمولی تکلیفوں کو برداشت نہیں کر سکتے. حالت یہ ہے کہ بڑے بڑے مسن آدمی بھی معمولی تکلیف میں چھوٹے بچّوں کی طرح روتے چلاتے ہیں صبر و استقلال کی کمی کی وجہ سے یہ لوگ بہت زیادہ سست و کاہل ہیں یہ الزام وہاں کے باشندوں پر بذات خود نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ یہ سب عادتیں انکو وراثتاً اپنے آبا و اجداد سے ملی ہیں۔ ان لوگوں میں ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ کبھی ایک دوسرے سے لڑتے نہیں بلکہ ایک خاندان کے کل افراد ایک ہی جگہ مل جل کر رہتے ہیں۔

اتنی ترقی کرنے پر بھی کشمیریوں میں راست بازی کا مادہ نسبتاً کم پایا جاتا ہے. لیکن یہ لوگ بہت شیریں زبان ہیں اور چھوٹے سے چھوٹے معاملے کو بھی اس حسن و خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ بالکل سچ معلوم ہوتا ہے۔ اسی سے اکثر لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ تعلیم کی وجہ سے اب رفتہ رفتہ یہ سب عادتیں چھوٹتی جاتی ہیں اور امید ہے کہ بہت جلد یہ سب عادتیں دور ہو کر یہ لوگ ایک اعلیٰ تہذیب یافتہ قوم ہو جائیں گے۔

اگر مالی حیثیت سے کشمیریوں کا مقابلہ کیا جائے تو سب لوگ برابر نہیں ہیں۔ سکھ اور دوگرا قوم کے لوگوں کا شمار حکمران اقوام میں

ہوتا ہے یہ لوگ زیادہ تر جموں اور اس کے گرد و نواح میں رہتے ہیں۔ ہندو جو یہاں کے قدیم باشندے ہیں بہت گورے چٹے ہوتے ہیں اور رنگ روپ میں انگریزوں سے مشابہ ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر شہروں میں آباد ہیں اور دفتروں میں ملازم ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد اگرچہ دوسری قوموں سے بہت زیادہ ہے لیکن یہ لوگ غریب ہیں اور دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ کاشتکاری ان کا خاص پیشہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ قریب قریب کل خطہ کا شتکاروں کا مسلمان ہے۔ تھوڑے سے مسلمان تجارت پیشہ بھی ہیں۔

ہندوؤں کی عورتیں زیادہ تر رنگین ساریاں پہنتی ہیں۔ مسلمان کی عورتیں لمبے لمبے ڈھیلے کرتے پہنتی ہیں جن کی آستینیں چوڑی ہوتی ہیں۔

فی زمانہ دیہاتی بھی ترقی کر رہے ہیں اور تعلیم حاصل کرنے کی طرف رجوع ہو گئے ہیں۔ دیہاتوں میں کہیں کہیں پر لوگ خوشحال نظر آنے لگے ہیں۔ جن لوگوں کی کچھ حالت درست ہو گئی ہے وہ بہت شان سے رہتے ہیں۔ ان میں موجودہ تہذیب کی ایک ہلکی سی جھلک بھی دکھلائی دیتی ہے۔ عام طور پر کشمیریوں کی تندرستی بہت اچھی ہوتی ہے۔ بدن بہت خوبصورت اور سڈول ہوتا ہے اس پر گورا رنگ سونے پر

سہاگے کا کام کرتا ہے۔

ان تمام لوگوں سے الگ ایک قوم ملاّحوں کی ہے کل کشمیر میں یہ لوگ تقریباً ۔۔۔۔۲۴ ہیں یہ لوگ ہانجی کہلاتے ہیں ان کو اس بات پر فخر ہے کہ ہم لوگ حضرت نوح کی اولاد سے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی کشتیاں اس قدر محفوظ اور آرام دہ ہوتی ہیں کہ اگر ان کو حضرت نوح کی کشتی سے تشبیہ دیجائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ ملاّحوں کی بھی بہت سی قسمیں ہیں ان میں سے ایک قسم وہ ہے جو تیرنے والے باغ لگاتے ہیں۔ یہ لوگ سنگھاڑے کی کاشت زیادہ کرتے ہیں اور عام ملاّحوں سے حیثیت میں ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ ان سے کم پایہ لوگ وہ ہیں جو کشتیاں چلاتے ہیں اور سب سے کم حیثیت وہ ہیں جو مچھلیوں کا شکار کرکے اپنی گذر اوقات کرتے ہیں۔

کشمیر میں دوسرے ملکوں کی طرح خانہ بدوش قومیں بھی ہیں۔ ان لوگوں کے اخلاق و عادات دوسرے ملک کے خانہ بدوش قوموں سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ لوگ عموماً چمڑے کا کام کرتے ہیں اور مرے ہوئے مویشیوں کی کھال نکال کر اس کو بناتے ہیں۔

ایک قوم گڈریے کی بھی کشمیر میں آباد ہے۔ یہ لوگ خاص کشمیر کے باشندے نہیں کہے جا سکتے یہ اپنے مویشیوں کو جگہ جگہ لئے پھرتے ہیں۔

جہاں ان کو اچھی چراگاہیں ملتی ہیں وہیں قیام کر دیتے ہیں لیکن سب سے زیادہ کارآمد قوم یہی ہے کیونکہ یہی لوگ بھیڑوں کی پرورش اور نگہبانی کرتے ہیں اور کارخانوں کو اون مہیا کرتے ہیں جس سے دوشالے اور دوسرے گرم کپڑے بنائے جاتے ہیں۔

اخلاق و عادات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو کشمیری عموماً بہت سخی ہوتے ہیں ان کی عورتیں امور خانہ داری میں طاق اور ساتھ ہی ساتھ شوہروں کی حد سے زیادہ مطیع ہوتی ہیں۔

کشمیریوں کے بچے بچیاں تو بہت خوبصورت ہوتے ہیں لیکن عموماً بہت گندے رہتے ہیں۔ پھر بھی وہ آزادانہ زندگی بسر کرتے ہیں ان کو ہر وقت پانی میں تیرنے کی اجازت رہتی ہے۔ اس سے ان بچوں کی تندرستی پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ اور بچوں کی طرح یہ بھی کھیل کے بہت شائق ہوتے ہیں اور طرح طرح کے کھیل تماشے گلیوں میں کیا کرتے ہیں۔ لڑکیاں زیادہ تر گھروں میں گڑیوں سے اپنا جی بہلاتی ہیں۔

مختصر یہ کہ بحیثیت مجموعی کشمیری اب پہلے سے بہت تہذیب و تعلیم یافتہ ہو گئے ہیں۔ ملک میں جابجا تھیٹر کے تماشے بھی ہوتے ہیں چند لوگ آپس میں مل کر ایک کمپنی بنا لیتے ہیں وہی کمپنی برابر ایک جگہ سے

دوسری جگہ سفر کرتی رہتی ہے۔

کشمیریوں کی خاص غذا چاول ہے کیونکہ وہاں دھان بہت پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ چاول کے یہ لوگ جو۔ گیہوں۔ سنگھاڑا اور اخروٹ کو پیس کر اس کے آٹے کی روٹیاں پکاتے ہیں۔ دودھ۔ مختلف قسم کے پھل۔ میوہ جات اور انڈے بھی بہت زیادتی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

اگر آب و ہوا کے لحاظ سے دیکھا جائے تو کشمیر کی آب و ہوا معتدل کہی جا سکتی ہے۔ کیونکہ وہاں کبھی تیز گرمی نہیں پڑتی یا برخلاف اس کے کبھی اتنی سردی بھی نہیں ہوتی کہ جس کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف محسوس ہو۔ سری نگر میں البتہ دوسرے حصوں سے زیادہ سردی ہوتی ہے۔ سردی میں کبھی تو وہاں کہرا پڑنے لگتا ہے اور کبھی برف باری ہوتی ہے۔ جب سردی بہت زیادہ پڑنے لگتی ہے تو خود سری نگر کے باشندے تکلیف محسوس کرتے ہیں کیونکہ وہاں کے مکانات اس قسم کے نہیں ہیں جو سردی کو روک سکیں۔ اسی لئے سردی سے محفوظ رہنے کے لئے ہر ایک شخص اپنے پاس ایک ایک انگیٹھی رکھتا ہے جس میں ہر وقت انگارے دہکتے رہتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب لوگ ان انگیٹھیوں کو ران کے

وقت اپنی پلنگ کے نیچے رکھ کر سو جاتے ہیں تو کپڑے گرمی پاکر جلنے لگتے ہیں۔ مکانوں میں آگ لگ جاتی ہے اور محلے کے محلے صاف ہو جاتے ہیں۔

سری نگر کے باشندوں کو سردی کی تکلیف کے علاوہ اور دوسری مصیبتوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً ہیضہ کشمیر میں بہت پھیلتا ہے اس کی خاص وجہ وہاں کے لوگوں کی گندگی ہے۔ کشمیری ہمیشہ ہیضہ سے بہت خائف رہتے ہیں مگر پھر بھی کبھی اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ حتی الوسع اپنی گندگی کو دور کریں اب محکمہ حفظان صحت قائم ہو جانے سے یہ باتیں رفتہ رفتہ دور ہوتی جا رہی ہیں۔ پہلے لوگ دریا کا پانی پیتے تھے جو نابدانوں اور کپڑوں کے دھونے کی وجہ سے بہت جلد بدبو کرنے لگتا تھا مگر جموّں اور سری نگر میں اب نل لگا دیئے گئے ہیں۔

مزید براں کشمیریوں کو زلزلے۔ سیلاب اور اکثر قحط کی بھی دقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ زلزلوں ہی کی وجہ سے بہت سی پرانی عمارتیں منہدم ہو گئیں ہیں جن کے کھنڈر جا بجا دیکھنے میں آتے ہیں۔

کشمیر کا نظام حکومت بھی اچھا ہے۔ لیکن ایک بات جو قابل

اعتراض ہے وہ یہ کہ وہاں شہر کے لوگوں کو دیہات کے کاشتکاروں
پر ترجیح دیجاتی ہے وہ اس طرح کہ جو کچھ غلہ پیدا ہوتا ہے ریاست
اس کو سستے داموں میں کاشتکاروں سے خرید لیتی ہے۔ یہ غلہ
شہر کے باشندوں کے ہاتھ انہیں داموں میں بیچ دیا جاتا ہے اس
کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو شہر والے دیہاتیوں کو حقیر نگاہوں سے
دیکھتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ بیچارے دیہاتی کبھی خوشحال نہیں
ہونے پاتے۔ اب دیہاتیوں کو بھی اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کا
خیال پیدا ہوگیا ہے اور ریاست کی توجہ بھی اس طرف مبذول
ہوگئی ہے وقتاً فوقتاً ایسے احکام بھی جاری ہوتے رہتے ہیں جس سے
ان لوگوں کی حالت رفتہ رفتہ درست ہوتی جارہی ہے۔

شہر کے باشندے اگرچہ ترحم خسروانہ کے سبب سے زیادہ
مستحق ٹھہرائے گئے ہیں لیکن نظام قدرت نے جو زندگی کا لطف
دیہات کے لوگوں کو عطا کیا ہے وہ شہر والوں کو خواب میں بھی نصیب
نہیں ہوتا تمام باتوں کو قطع نظر کرتے ہوئے اگر صرف مکانوں
ہی کا مقابلہ کیا جاوے تو دیہات کے مکان شہر کے مکانوں سے
زیادہ آرام دہ صاف اور ہوادار ہوتے ہیں۔ ان تمام خوبیوں کے
علاوہ قریب قریب ہر مکان میں چھوٹا سا پائیں باغ بھی ضرور

ہوتا ہے جس میں طرح طرح کے میوے اور پھل کثرت سے پیدا ہوتے ہیں ہر ایک گاؤں کے متصل ایک بڑا کھلا ہوا میدان بھی ہوتا ہے جس میں فرصت کے وقت اس گاؤں کے باشندے بیٹھ کر اپنا وقت گذارتے ہیں۔ البتہ اس بات میں ضرور دیہاتی بد قسمت ہیں کہ قحط سالی کے زمانے میں ان بیچاروں کو شہریوں سے زیادہ بھوک پیاس کی تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔

کشمیر کی خاص زبان بھی ہندوستان کے اور حصّوں سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں بہت زیادہ سنسکرت۔ فارسی۔ عربی۔ پنجابی اور اردو کے الفاظ شامل ہیں۔ جو لوگ سیاحت کی غرض سے کشمیر جاتے ہیں وہ وہاں کی خاص زبان نہیں سمجھ سکتے۔ ان کو مترجم ساتھ رکھنا پڑتا ہے خود گھوڑے اور ٹٹو والے مترجم کا کام دیتے ہیں لیکن یہ لوگ قابل اعتبار نہیں ہیں۔ ان میں اکثر بہت دھوکا دیے جاتے ہیں۔

کشمیری زبان زیادہ تر دیہاتوں میں رائج ہے۔ سوداگر اور گاؤں کے مکھیا تھوڑی بہت اُردو بھی سمجھ لیتے ہیں تعلیم یافتہ طبقہ میں فارسی اور دوسری ہندوستانی زبانیں اچھی طرح رائج ہیں کچھ عرصہ سے اسکولوں میں انگریزی زبان کی تعلیم بھی شروع ہوگئی ہے اور اس میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے اب انگریزی عدالتی

زبان قرار دیدی گئی ہے اور سب کام انگریزی میں ہوتا ہے۔

کشمیر کے آثار قدیمہ

کشمیر کے آثار قدیمہ میں زیادہ تر وہاں کے مندر۔ مسجدیں اور دیگر پرانی عمارتیں ہیں۔ ان تمام چیزوں کے دیکھنے سے قدیم زمانہ کے ترقی کا اندازہ ہوتا ہے قریب قریب ہر عمارت میں گول تراشے ہوئے کھمبے اور سہ گوشیہ محرابیں کثرت سے موجود ہیں۔

جو عمارتیں مغل بادشاہوں کی تعمیر کردہ کہی جاتی ہیں وہ ہر طریقہ پر یونانی طرز تعمیر سے ٹکر کھاتی ہیں بلحاظ موقع کے سب سے اچھا مندر وہ ہے جو تخت سلیمان پہاڑ کی چوٹی پر بنا ہوا ہے۔ اس کا راستہ پہاڑوں کی چٹانوں کو کاٹ کر بنایا گیا ہے اور اکثر جگہ بہت مخدوش ہے۔ مگر سیکڑوں برس کے آمدورفت سے اب اس قدر عام ہو گیا ہے کہ لوگوں کو اس پر جاتے ہوئے خوف نہیں معلوم ہوتا۔ جس مقام پر مندر بنا ہے وہ جگہ کشمیر کی آبادی سے قریب ۱۰۰۰ فٹ کے بلند ہے۔ وہاں سے آدمی کھڑا ہو کر سری نگر کا شہر مع پہاڑوں اور میدانوں کے اچھی طرح دیکھ سکتا ہے۔ وہاں سے اتر کی طرف

بہت دور پر پیر پنجال کے برف آلودہ پہاڑ معلوم ہوتے ہیں اور دکھن کی طرف دھوپ میں چمکتی ہوئی ننگا پربت کی چوٹی دکھائی دیتی ہے۔ باقی دو طرف سانپ کے طرح بل کھائے ہوئے دریائے جہلم کا پانی دھوپ میں آئینہ کی طرح چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

یہ مندر بہت پرانا ہے۔ لوگوں کا قیاس ہے کہ گوپا دت اور لالتاوت کے زمانہ میں بھی یہ مندر قائم تھا۔ امتداد زمانہ سے پرانا مندر قائم نہ رہ سکا اور منہدم ہوگیا۔ ۲۵ء میں موجودہ مندر اس کی جگہ پر تعمیر کیا گیا اس مندر میں قابل دید چیز اس کا گنبد ہے۔ یہ گنبد بالکل پتھر کا بنا ہے اور بہت بڑا ہے۔ لوگوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح معماروں نے اتنے بڑے بڑے پتھر اتنی اونچائی پر لے جاکر نصب کیے ہوں گے اور پھر وہ بھی اسی طرح کہ کہیں جوڑ کا پتہ نہیں چلتا۔ فی زمانہ بہت سا حصہ اس مندر کا منہدم ہوگیا ہے۔ جو تھوڑا بہت حصہ اب باقی ہے وہ بھی بالکل بے مرمت ہے کوئی اس کی نگہداشت نہیں کرتا۔ زیادہ حصہ منہدم ہو جانے کی وجہ سے بہت کم پوجاری وغیرہ بھی وہاں رہتے ہیں۔

تخت سلیمان سے تھوڑی دور نیچے اتر کر شنکر مٹھ ہے۔ اس کو درگا ناگ مندر بھی کہتے ہیں۔

ایک دوسرا بہت پرانا مندر بھامجو میں ہے لیکن وہ بھی بالکل منہدم ہوگیا ہے۔

سب سے بہتر مقام جس سے پرانے زمانہ کی تہذیب اور وہاں کے باشندوں کے مذہبی عقائد پر روشنی پڑتی ہے مرتنڈ مندر کے کھنڈر ہیں۔ یہ مندر ایک سرسبز میدان میں بنا ہوا تھا۔ اس کے بالکل پشت پر پہاڑ ہیں جو سال کے زیادہ حصہ میں برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ مندر کے چاروں طرف طرح طرح کے خوبصورت درخت اور بیل بوٹے لگے ہوئے ہیں۔ جن کے درمیان میں صاف و شفاف پانی کے چشمے جاری ہیں۔ ان چشموں کا پانی پیکر دل کو عجیب فرحت حاصل ہوتی ہے۔ یہ مندر قریب قریب ۷۵ فٹ اونچا تھا۔ لیکن اب بالکل منہدم ہوگیا ہے۔ باہر کے سیاح ان مندروں کو محض آثار قدیمہ سمجھکر دیکھنے آتے ہیں۔

جس وقت یہ مندر قائم تھا اس وقت اس میں ایک بہت بڑا کمرہ تھا جو ۲۲۰ فٹ لمبا اور ۴۲ فٹ چوڑا تھا۔ اس میں چاروں طرف ترشے ہوئے سنگی کھمبے لگے ہوئے تھے۔ انہیں کھمبوں پر اس کمرہ کی چھت قائم تھی کمرہ تو بالکل گر گیا ہے لیکن کچھ کھمبے اب تک باقی ہیں۔

ان آثار قدیمہ کی یہ ردی حالت اس وجہ سے ہوگئی کہ جن خارجی

طاقتوں نے کشمیر کو فتح کیا انھوں نے کبھی ان عمارتوں کی مرمت کا خیال نہیں کیا۔ بلکہ اکثر ان میں ایسے حکمران گذرے ہیں جنہوں نے برقرار رکھنا تو درکنار ان عمارتوں کو نیست و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ چنانچہ عہد مغلیہ کی جتنی بڑی بڑی عمارتیں تھیں ان میں سے اب سوائے چند باغات کے ایک کا بھی پتہ ونشان تک نہیں چلتا اگر وہ سب عمارتیں اس وقت موجود ہوتیں تو غیر ملکی سیاحوں کے لئے مزید دلچسپی کا باعث ہوتیں۔

شہر سے قریب ہری پت کی ایک پہاڑی ہے۔ اس پر اکبر کے زمانہ کا تعمیر کیا ہوا ایک قلعہ ہے۔ جس میں ایک مندر بھی ہے یہ قلعہ اب تک فوجوں کے ٹھہرانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مسلمان اس پہاڑ کو کوہ عمراں کہتے ہیں۔ اس مندر سے پورب کی طرف تھوڑے فاصلہ پر مخدوم شاہ اور آنکھ کمل شاہ کی زیارت گاہیں ہیں۔

مغلوں کا ستارہ گردش میں آنے کے ساتھ ہی کشمیر پر تباہی و بربادی کی گھٹا چھا گئی اور لوگوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں یہ بیچارے خود اپنی فکر کرتے یا ان آثار قدیمہ کے قائم و برقرار رکھنے کی کوشش کرتے۔ تمام ملک میں ظلم وجور کی ہوائیں چل رہی تھیں اور لوگ روز بروز غریب ہوتے جاتے

تھے۔

ان آثار قدیمہ کے منہدم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ابتدا ہی سے کشمیر میں مختلف مذہب اور عقیدہ کے بادشاہ حکمراں رہے۔ چنانچہ جو بادشاہ ہوا اس نے جن عمارتوں کو اپنے مذہب اور عقیدہ کے مطابق پایا ان کو برقرار رکھا اور باقی ماندہ عمارتوں کو مسمار کر دیا۔ مثلاً شروع میں جب کشمیر میں بودھ مذہب کا چرچا ہوا تو بہت سے مندر بنوائے گئے لیکن گیارھویں صدی عیسوی کے بعد سے وہاں بودھ مذہب کو روز بروز زوال اور ہندو مذہب کا عروج شروع ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ بودھ مذہب کے مندر ویران ہونا شروع ہو گئے۔ وہاں کے پوجاری اپنی اپنی جان کے خوف سے ان مندروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ تھوڑے دنوں میں یہ مندر خود بخود منہدم ہو گئے۔ اب ان کا پتہ و نشان تک نہیں ملتا۔

ہندوؤں کے بعد مغلوں کا ستارہ چمکا اور وہ برسر حکومت ہوئے مغلوں نے پرانی عمارتوں کو مسمار نہیں کیا بلکہ اپنی طرف سے بہت سی

جدید عمارتیں تعمیر کرائیں جہانگیر نے اپنے رہنے کے لئے ایک بارہ منزل کا محل بنوایا تھا جس کا اب کہیں نام ونشان بھی نہیں ملتا. مغلوں کی بنوائی ہوئی عمارتیں پٹھان بادشاہوں کی غفلت سے مسمار ہو گئیں۔ عمارتوں کے علاوہ مغلوں نے بہت سے خوشنما باغ بھی لگوائے تھے. چنانچہ اس وقت بھی کشمیر کے بہترین باغات اُسی عہد کی یادگار ہیں۔

مندروں کے علاوہ کشمیر میں مسلمانوں کی مسجدیں بھی ہیں لیکن پرانی مسجدیں لکڑی کی بنی ہوئی ہیں فتح خاں کے پل سے متصل سری نگر میں شاہ ہمدان کی مشہور مسجد ہے اس مسجد کی دیواریں سب لکڑی کی ہیں۔ اور اس میں سیڈر کی لکڑی کے منقش کھمبے جابجا لگے ہوئے ہیں۔ مسجد کے اندر کی چھت بہت خوبصورت ہے۔ اس میں تمام قسم کے نقش ونگار بنے ہوئے ہیں۔ بالکل اوپر کی چھت البتہ کچی ہے۔ بہار کے زمانہ میں اس پر سبزہ اور رنگ برنگ کے پھول اُگ آتے ہیں اور سردیوں میں اس پر ایک بہت ہلکی تہ برف کی جم جاتی ہے۔ ان دونوں موسموں میں اس مسجد کا منظر قابل دید ہوتا ہے۔ مسجد کے احاطہ سے ملا ہوا ایک چشمہ ہے ہندو اس چشمے کو بہت متبرک خیال کرتے ہیں اور مختلف اوقات پر یہاں آکر

پوجا کرتے ہیں۔

دریائے سندھ کے بہاؤ پر تھوڑے دور چل کر نور جہاں کی بنوائی ہوئی ایک اور مسجد ہے۔ یہ مسجد بالکل پختہ ہے اور پتھر کی بنی ہوئی ہے یہ مسجد اور مسجدوں کے مقابلے میں بہت خوبصورت ہے۔

مختصر یہ کہ جو تھوڑی بہت پرانی یادگاریں اب تک قائم ہیں اگر ان کی برابر نگہداشت ہوتی رہی تو ممکن ہے کہ ایک عرصہ تک قائم رہیں اور باہر سے آنے والوں کے لئے تھوڑا بہت دلچسپی کا سامان مہیا کرتی رہیں لیکن اگر ان کے ساتھ بھی بے توجہی عمل میں لائی گئی تو یہ سب چیزیں جو پرانے تمدن کی خاموش یادگاریں ہیں ہمیشہ کے لئے دنیا سے ناپید ہو جائیں گی۔

سری نگر کی وادی میں جہاں سے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ایک جگہ پر کچھ پتھر زمین میں نصب ہیں جو شکل میں بالکل تیر سے مشابہ ہیں۔ کشمیر کے باشندوں کا خیال ہے کہ یہ وہ تیر ہیں جن کو دیوتاؤں نے شیطانوں سے لڑنے میں صرف کیا تھا۔ یہ شیطان رعایا کو بہت تکلیف پہونچاتے تھے۔ ان کی وجہ سے لوگوں کو ہر وقت جان و مال کا خوف لگا رہتا تھا۔ کل دیوتاؤں نے مل کر ایک بار ان پر حملہ کیا اور ان کو تباہ و برباد کر کے ہمیشہ کے لئے لوگوں کو ان کے ظلم و جور

سے محفوظ کردیا۔

کشمیریوں کا مذہب

فی زمانہ کشمیر میں مختلف مذہب کے پیرو پائے جاتے ہیں دیہاتوں میں قریب قریب کل آبادی مسلمانوں کی ہے۔ لیکن شہروں میں نسبتاً ہندو زیادہ ہیں۔ ہندو اب تک فقیروں اور سادھوؤں کو بہت مانتے ہیں اور بھوت پریت سے بھی ہر وقت بہت زیادہ خائف رہتے ہیں۔

کچھ لوگ کشمیر میں ایسے بھی ہیں جو سانپوں کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ لوگ بودھ مذہب کے رواج پانے سے پہلے یہاں آباد تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ بڑے بڑے اژدھے اور سانپ پہاڑوں اور چشموں میں رہتے ہیں اگر ان کی پرستش نہ کی جاوے گی تو اُن کے جان و مال کو نقصان پہونچیگا۔ اسی ڈر سے یہ لوگ ان سانپوں کو پوجتے تھے اور اکثر بڑے بڑے تالاب بنا کر اس میں پانی بھر دیتے تھے تاکہ سانپوں کا بادشاہ آکر اس میں مقیم ہو۔ ان باتوں کے کرنے میں یہ لوگ اپنی فلاح و بہبودی سمجھتے تھے۔ رفتہ رفتہ سانپوں کے پوجنے کا خیال

مذہبی عقائد میں شامل ہو گیا اور ایک فرقہ ایسا قائم ہو گیا جو سانپوں کے پوجنے کو اپنا دین و ایمان سمجھنے لگا۔ لیکن پہلے بدھ مذہب اور اس کے بعد ہندو مذہب کے پھیلنے سے اس فرقہ میں روز بروز کمی ہونے لگی چنانچہ اب بہت تھوڑے باشندے ایسے ہیں جو سانپوں کے پوجنے کو جائز سمجھتے ہیں۔

سانپوں کی پرستش کا ایک بہت بڑا اثر یہ ہوا کہ پرانی جگہوں کے نام ناگ پر (جس کے معنے سانپ ہیں) رکھے جانے لگے۔ ورناگ انگ ناگ کے سے نام اسی زمانے کے یادگار ہیں۔

سانپوں کا پوجا کرنا محض کشمیریوں ہی کی جدّت نہیں ہے۔ تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اور ملکوں میں بھی سانپوں کی پرستش ہوتی تھی۔ چنانچہ چین کی تاریخ میں بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن اب یہ عقائد چینیوں کے درمیان سے بالکل ناپید ہو گئے ہیں۔

اسی طرح انجیل کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل بھی ایک زمانے میں سانپوں کی پوجا کرتے تھے اور انہیں سانپوں کی پرستش کی وجہ سے ان پر عذاب نازل ہوا اور وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ ان تمام مذاہب کے علاوہ کشمیر میں عیسائیوں کے متعدد

مشن کام کر رہے ہیں فی زمانہ ان لوگوں نے وہاں کے باشندوں میں بہت سے رسوخ حاصل کر لیا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ عیسائی مذہب کو اچھی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مگر ان کا مذہب کھلم کھلا اختیار کرنے پر مستعد نہیں ہوتے اس لئے اگرچہ بادی النظر میں عیسائی مذہب کو کچھ رواج ہو چلا ہے مگر لوگ اب تک اپنے قدیم مذہبوں پر بدستور قائم ہیں۔

سری نگر کا شہر اور اس کی صنعت و حرفت

یوں تو سری نگر کشمیر کا سب سے بڑا اور خوشنما شہر ہے لیکن جب خاص خاص موقعوں پر یہ شہر سجایا جاتا ہے تو اس کی خوبصورتی اور دلکشی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ خاص موقع وہ ہے جب مہاراجہ صاحب سری نگر تشریف لاتے ہیں۔ اس وقت رؤساء شہر بڑی بڑی کشتیوں میں جن پر زرق برق شامیانے لگے رہتے ہیں بیٹھ کر مہاراجہ صاحب کے استقبال کے لئے جاتے ہیں۔ انہیں کشتیوں میں کچھ کشتیاں پردہ دار بھی ہوتی ہیں جن میں ان کی عورتیں بیٹھی ہوتی ہیں۔ جب مہاراجہ صاحب کے آمد کی خبر ہوتی ہے تو کل کشتیاں نہر کے کنارے رسیوں سے

دو رویہ باندھ دی جاتی ہیں۔ مہاراجہ صاحب کی کشتی انہیں کے درمیان سے ہوتی ہوئی گذر جاتی ہے۔ جن لوگوں کے مکانات نہر کے کنارے واقع ہیں وہ اپنے اپنے مکان کے دروازوں اور کھڑکیوں میں قیمتی شالی پردے اور چھتوں پر رنگ برنگ کے دوشالے ڈال دیتے ہیں۔

شہر کے اندر ایک بہت بڑا عجائب خانہ ہے۔ اس عجائب خانے میں پُرانی دستکاری کے بہترین نمونے مشاہدہ میں آتے ہیں۔ یہاں شیشے کی الماریوں میں پُرانے زمانے کے بنے ہوئے دوشالے اور ریشمی کھان رکھے ہوئے ہیں۔ انہیں شالوں اور ریشمی کپڑوں کی وجہ سے کشمیر کا نام ایک زمانے میں دور دراز ملکوں میں بہت مشہور ہو گیا تھا۔

سب سے پہلے شالوں کا استعمال کشمیر میں سنہ ۱۴۱ء میں شروع ہوا تھا۔ اس زمانہ میں شال کا بنانا کشمیر کی خاص صنعت و حرفت میں شامل تھا۔ اس وجہ سے اس فن کو روز بروز ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ یہ فن اس ملک میں کمال کو پہونچ گیا۔ لیکن بمصداق "ہر کمالے را زوال"، لوگوں کی توجہ اس طرف رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور اب اس کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔

فی الحال کارچوبی اور بیل بوٹا کاڑھنے کا کام کشمیر میں بہت زیادہ ترقی پر ہے۔ یہ کام دو قسم کا بنتا ہے۔ ایک قسم کا کام وہ ہے جو بہت نازک اور عمدہ ہوتا ہے اور زیادہ تر ریشمی اور اونی کپڑوں پر بنتا ہے اس کی اجرت بھی محنت کے لحاظ سے بہت زیادہ ہوتی ہے دوسرے قسم کا کام سوتی کپڑوں پر ہوتا ہے۔ یہ کام دوسرے کام کے بہ نسبت سستا بنتا ہے۔

اس قسم کا مال زیادہ نفع کے ساتھ زیادہ تر یورپی بازاروں میں بکتا ہے۔ یا وہ لوگ ان چیزوں کو خریدتے ہیں جو دوسرے ملکوں سے کشمیر کی سیر کو ہر سال آتے ہیں۔ یہ سیّاح ان چیزوں کو کشمیر کا خاص تحفہ سمجھکر بہت دام میں خریدتے ہیں۔ اس کے علاوہ پھیری والے سوداگران چیزوں کو کشمیر سے خرید کر قریباً ہندوستان کے ہر گوشہ میں پہونچاتے رہتے ہیں۔

اونی کپڑوں میں کشمیر کا پٹو بہت زیادہ مشہور ہے۔ یہ ایک قسم کا گرم کپڑا ہوتا ہے۔ تیز سے تیز سردی میں بھی یہ کپڑا بہت مفید ثابت ہوا ہے کیونکہ اصل پٹو خالص اون سے بُنا جاتا ہے چونکہ یہ کام بہت دنوں سے ہوتا چلا آرہا ہے اس لئے اعلیٰ اعلیٰ درجے کے پٹو تیار ہوتے ہیں ایک وقت ایسا بھی آگیا تھا کہ اس کپڑے کی نکاسی اس قدر

کم ہوگئی تھی کہ برسوں پٹو کے تھان دوکان میں پڑے رہتے تھے مگر اب ایسا نہیں ہے۔

اس زمانہ میں عام طور پر لوگ ہر ایک چیز عمدہ سے عمدہ خریدنا چاہتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ہی قیمت کا بھی بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ چونکہ کشمیر میں زیادہ تر کام ہاتھ سے ہوتا ہے اور مشین سے تیار کئے ہوئے مال سے ارزانی میں مقابلہ نہیں کرسکتا اس لئے تمام صنعتوں میں جو کشمیر کے لئے مایۂ ناز ہیں بجائے ترقی کے روز بروز تنزلی ہوتی جارہی ہے۔

کپڑوں کے علاوہ سونے چاندی اور تانبے کے برتنوں پر نقاشی کا کام بہت اچھا اور سبک بنتا ہے۔ اس کے علاوہ لکڑی پر بھی بہترین قسم کی نقاشی ہوتی ہے۔ ان صنعتوں کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کی کوشش کیجارہی ہے اور ہر سال لوگ ان کاموں کو سیکھنے کے غرض سے دوسرے ملکوں کو جاتے ہیں۔

کشمیر کے جوہری اور مرصّع ساز بھی بہت ہوشیار ہیں۔ اور اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے زیور تیار کرسکتے ہیں جو جواہرات پہاڑوں میں ملتے ہیں ان کو یہ لوگ نکال کر تراشتے ہیں اور اس سے طرح طرح کی عمدہ اور خوبصورت چیزیں بناتے ہیں۔ یہ چیزیں چاندی یا پیتل میں نصب کر کے فروخت کیجاتی ہیں۔ اگرچہ ان چیزوں کی

مقامی لوگوں میں قدر نہیں ہے لیکن باہر جاکر یہ چیزیں بہت دام سے فروخت ہوتی ہیں۔

کشمیر کے پہاڑوں میں نیلم اور زمرد دستیاب ہوتا ہے لوگوں کا خیال ہے کہ ہرمک پہاڑ میں زمرد کی ایک بہت بڑی کان ہے لیکن ابھی تک اس کا پتہ نہیں چلا۔ علاوہ ان جواہرات کے سنگ سلیمان۔ حجر الدّم۔ عقیق اور بلور وغیرہ یارقند سے آتے ہیں۔ یہاں ان پتھروں پر بہت اچھی جلا ہوتی ہے۔ اور ان کو تراش کر ہر ایک قسم کی چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔

فی الحال کشمیر میں قالین سازی اور ریشم کی تجارت کو بہت زیادہ ترقی دی جا رہی ہے۔ یوں تو سری نگر میں قالین بننے کے سیکڑوں کارخانے ہیں لیکن مشہور صرف دو ہی تین ہیں۔ کشمیر کے کارخانے اور جگہوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ محض ایک کھپریل سے چھائے ہوئے چھپر کے نیچے سیکڑوں کرگے ہوتے ہیں۔ ایک ایک کرگے پر چھ چھ سات سات آدمی کام کیا کرتے ہیں۔ ایک شخص جو مستری ہوتا ہے کئی کئی کرگوں پر تعینات رہتا ہے اور برابر کام کرنے والوں کو ہدایت کرتا رہتا ہے اور کام کی نگرانی بھی کرتا جاتا ہے اسی کارخانے کے اوپری حصّہ میں دوکان ہوتی ہے جہاں پر

مالک کارخانہ رہتا ہے۔ دوکان میں جس قیمت اور جس نفاست کے قالین لوگ چاہیں خرید سکتے ہیں۔

ریشم کے تجارت کی طرف بھی ریاست کی توجہ خاص طور پر مبذول ہے۔ چونکہ کشمیر میں شہتوت کے درخت بہت کثرت سے ہیں اس لئے قریب قریب ہر دیہات میں ان درختوں پر ریشم کے کیڑے پالے جاتے ہیں۔ جو کچا ریشم اس طرح پر دستیاب ہوتا ہے وہ کارخانوں میں لاکر تاگوں کی صورت میں بنایا جاتا ہے جب تاگا تیار ہو جاتا ہے تو ان سب کا پارسل بنا کر دوسرے ملکوں میں کپڑا بننے کے لئے بھیج دیا جاتا ہے۔ ریشم کی تجارت کو فروغ ہونے سے ریاست کی آمدنی میں معتدبہ اضافہ ہو گیا ہے۔

سری نگر سے شہر میں ایک چھوٹا سا خطّہ انگریزی آبادی کا بھی ہے۔ یہ آبادی رزیڈنسی سے ملحق ہے۔ اس آبادی میں دو گرجے ایک کلب گھر ایک کتب خانہ۔ ایک گھوڑ دوڑ کا میدان۔ کرکٹ اور پولو کھیلنے کی زمین اور ایک انگریزی ہوٹل ہے۔

کل شہر میں تین اسپتال ہیں دو اسپتال تو ریاست کے ہیں اور ایک اسپتال مشن والوں کا ہے۔ ان اسپتالوں میں سالانہ قریب قریب ۳۰۰۰۰ مریضوں کا علاج ہوتا ہے۔ اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر میں اسپتالوں کی سخت ضرورت ہے۔ بہر حال جو اسپتال اس وقت قائم ہیں وہ اچھے پیمانے پر چل رہے ہیں۔ ان اسپتالوں کے ڈاکٹر وقتاً فوقتاً دیہاتوں میں بھی دورہ کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ دیہات کے لوگ اس نعمت غیر مترقبہ سے محروم نہ رہیں۔

سری نگر کا بازار اگرچہ اچھا نہیں ہے تاہم غنیمت ہے۔ ہر ایک جگہ پر ایک ہی قسم کی متعدد دوکانیں ہیں حالانکہ دوسرے شہروں میں علاوہ بساط خانہ اور کپڑے کی دوکانوں کے دوسرے چیزوں کی دوکانیں تعداد میں دو چار سے زیادہ نہیں ہوتیں۔ جس سڑک پر نکل جائیے وہیں پر ایک عجیب منظر پیش نظر ہوتا ہے۔ کہیں پر لوہار اپنی بھٹی جلائے کام کر رہا ہے تو بالکل اسی سے متصل کمہاروں کی دوکانیں ہیں جن میں ہر ایک قسم کے چھوٹے بڑے برتن بکھرے پڑے ہیں۔ اسی کے برابر بڑھئی کی بھی دوکان ہے وہیں سبزی فروش بھی ٹوکریوں میں سبزی لگائے بیٹھے ہیں۔ آگے بڑھ کر بزازہ ہے وہیں پر درزیوں کی دوکانیں ہیں۔ غرضکہ سو دو سو قدم کے اندر ہر ایک قسم کی دوکان مل جاتی ہے۔

شہر میں اور دوکانوں کے مقابلہ میں چائے کی دوکانیں بہت زیادہ ہیں۔



ہمالیہ کی ایک برف پوش چوٹی

ہر گلی میں دس پانچ دوکانیں چائے کی ضرور ہیں۔ کیونکہ کشمیری چائے کے بہت عادی ہیں۔ کشمیریوں کا چائے بنانے کا طریقہ بھی اور لوگوں سے بالکل الگ ہے۔ چائے کی دوکانیں دیکھنے میں تو بہت معمولی معلوم ہوتی ہیں لیکن ہر ایک دوکان میں اچھی سی اچھی چائے مل سکتی ہے۔ نان بائیوں کی دوکانیں بھی سری نگر میں بہت زیادہ ہیں جن میں ہر وقت گرم کھانا دستیاب ہو سکتا ہے۔

کشمیر کے پہاڑ اور سبز میدان

کشمیر کا کل خطّہ چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ ان پہاڑوں میں اکثر مقامات پر درّے ہیں جن میں سے کشمیر میں داخل ہونے کے راستے ہیں۔ کشمیر اور اس کے گردونواح میں سب سے نیچا پہاڑ بھی سطح سمندر سے ۵۰۰۰ فٹ بلند ہے انہیں پہاڑوں میں متعدد و مشہور و معروف چوٹیاں ہیں مثلاً ننگا پربت کی چوٹی سمندر کی سطح سے تقریباً ۲۷۰۰۰ فٹ بلند ہے اور سال بھر برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ برف کی سفیدی کی وجہ سے یہ چوٹی دور سے دکھائی دیتی ہے۔ جب اس پر دھوپ کی کرنیں پڑتی ہیں تو آئینے

کی طرح چمکتی ہے۔

اکثر سیاح باہر سے ان چوٹیوں پر چڑھنے اور وہاں کے حالات دریافت کرنے کی غرض سے آئے لیکن آج تک کوئی شخص وہاں پہونچ نہیں سکا۔ ایک مرتبہ تین آدمی پروفیسر کالی۔ مسٹر ہیسٹنگز اور میجر بروس اس ارادہ سے یہاں آئے تھے کہ ننگا پربت کی چوٹی کے حالات دریافت کریں مگر موت کا فرشتہ پہلے سے ان کے انتظار میں وہاں بیٹھا تھا۔ یہ لوگ وہاں سے صحیح وسالم واپس نہ آسکے اور ہمیشہ کے لئے اس پہاڑ پر موت کی نیند سو گئے۔

اس کے بعد ڈاکٹر ممری صاحب نے دوبارہ کوشش کی مگر وہ بھی اور لوگوں کی طرح وہاں سے زندہ واپس نہ ہوئے۔

یوں تو جس طرف سے ننگا پربت کو دیکھا جائے نہایت دلکش منظر آنکھوں کے سامنے پیش ہو جاتا ہے لیکن سب سے اعلیٰ اور دلکش منظر ننگا پربت کا لولاب کے میدان سے دکھائی دیتا ہے۔ یہ میدان بالکل ننگا پربت کے سامنے ہی واقع ہے۔ اس میدان سے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور بند رنج پہاڑ اونچے ہوتے چلے گئے ہیں۔ یہانتک کہ ان کا سلسلہ ننگا پربت پر جاکر ختم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ درمیان کے پہاڑ کسی جگہ پر

۱۴۰۰۰ اور ۱۵۰۰۰ فٹ سے کم اونچے نہیں ہیں لیکن ننگا پربت کی سربفلک کشیدہ چوٹی کے سامنے یہ سب پہاڑ اس طرح پر سر تسلیم خم کئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی بادشاہ کے سامنے اس کے امرا اور وزراء دست بستہ کھڑے ہوں۔

لولاب کے میدان سے ننگا پربت کا سماں خاص کر غروب آفتاب کے وقت بہت ہی دلکش ہوتا ہے اس وقت ڈوبتے ہوئے آفتاب کی ترچھی اور سرخی مائل کرنیں برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں پر پڑتی ہیں درختوں کی سرسبزی رنگ برنگ کے پھولوں سے ملکر دل میں عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے۔ جس وقت ہوا کے ٹھنڈے جھونکے ان درختوں سے ہوکر گذرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کل چیزیں اپنی خداداد حسن پر جھومتی اور جُھک جُھک کر اس خالق بے نیاز کا سجدہ کرتی ہیں۔

پانی کے چشمے جو ہر طرف ان پہاڑوں سے جاری ہیں وہ دور سے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی محبوب دلنواز کے پرافشاں گیسو ہوا میں لہرا رہے ہوں۔

ننگا پربت کے علاوہ ہرمکھ پہاڑ کا منظر بھی بہت دلکش ہے۔ یہ پہاڑ وولر لیک کے بالکل کنارے واقع ہے یہ پہاڑ تقریباً

۱۴۰۰۰ فٹ اونچا ہے اور ننگا پربت کی طرح برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ پورے پہاڑ کا عکس جھیل کے صاف اور ٹھہرے ہوئے پانی میں پڑتا رہتا ہے۔ جھیل میں ہر طرف کثرت کے ساتھ سبزہ اُگا ہوا ہے اس میں سفید پہاڑوں کا عکس اس طرح معلوم ہوتا ہے جیسے کسی معشوق سبزہ پوش کا عکس آئینہ میں پڑتا ہو۔

ان پہاڑوں پر کثرت کے ساتھ آبشار ہیں۔ جس وقت یہ آبشار پہاڑ سے نیچے آتے ہیں تو پانی کے علاوہ اپنے ساتھ برف کے بڑے بڑے ٹکڑے بھی لاتے ہیں جن میں اکثر بہت بڑے ہوتے ہیں ان ٹکڑوں کے زمین پر گرنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ میلوں سے سنائی دیتی ہے اور سننے والے کے دل میں وحشت پیدا کرتی ہے۔

کوہالی پہاڑ ان پہاڑوں سے بالکل مختلف ہے اس کی چوٹی سوئی کی نوک کی طرح نکیلی ہوتی چلی گئی ہے اور اس کے اردگرد کے پہاڑ قریب قریب مسطح ہیں۔ اس پہاڑ کو جو راستہ گیا ہے اس میں بہت سے گھنے جنگل اور مرغزار ہیں جس کے دیکھنے سے طبیعت خوش ہوتی ہے۔

توتا کٹی ایک دوسرا بہت مشہور پہاڑ ہے۔ یہ پہاڑ بھی قریب ۱۴۰۰۰ فٹ کے اونچا ہے۔ گلمرگ کا شہر اسی پہاڑ کے دامن میں

آباد ہے۔ اگرچہ گنج ناگ کے پہاڑ اس پہاڑ کو پورے طور پر پوشیدہ کئے ہوئے ہیں لیکن اس کی چوٹی کبھی نیلی اور کبھی سرخ اور کبھی سفید ہو کر برابر دکھلائی دیتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ پہاڑ اپنے حسن کے پوشیدہ ہو جانے کی وجہ سے گنج ناگ پہاڑ پر لال پیلی آنکھیں نکال کر غصّہ ہو رہا ہے۔

ان تمام پہاڑوں کے دامن میں بہت سے دریا جھیلیں اور اور مرغزار ہیں جو ان پہاڑوں کے حسن کو دوبالا کرنے میں بہت معاون ہوتے ہیں۔ پہاڑوں کے مناظر کو قطع نظر کرتے ہوئے بھی اگر محض ان مرغزاروں کو دیکھا جائے تو ان میدانوں کا منظر کسی طرح پہاڑوں سے کم دلچسپ نہیں ہے۔ ان میدانوں میں میلوں تک ہری ہری گھاس اُگی ہے جو مخمل کی طرح چکنی ہوتی ہے۔ انہیں گھاسوں میں تھوڑی تھوڑی دور پر مختلف رنگ کے خودرو پھول پیدا ہو جاتے ہیں دور سے دیکھنے پر بلا مبالغہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میدان میں میلوں تک ایرانی سبز قالین بچھے ہوئے ہیں۔ ان میدانوں کے خداداد حسن کو دیکھ کر خدا کی قدرت یاد آتی ہے۔ سری نگر کے گرد و نواح میں نگ مارگ کا مرغزار بہت مشہور ہے۔ اس مرغزار کے چاروں طرف صنوبر کے درختوں کی ایک دلکش دیوار سی ہے۔

ان درختوں کے درمیان سے ننگا پربت اور ہرمک پہاڑ کی برف آلود چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان تمام مناظر کے ایک جگہ جمع ہو جانے سے اس مرغزار کی دلکشی میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔

اسی قسم کا ایک دوسرا میدان سون مرگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میدان کا منظر بھی بہت دلکش ہے۔ یہاں لوگ اکثر چاندنی رات میں خیمہ ڈالکر رہتے اور چاندنی رات کا لطف اٹھاتے ہیں۔

اس میدان میں پھول بہت کثرت سے ہیں یہاں سال بھر پھولوں کی بہار رہتی ہے۔ اس کے پشت پر جنگل ہے جس کے بعد برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں۔ میدان سے ۲۰ گز کے فاصلہ پر ایک دریا ہے۔ ان سب چیزوں کی وجہ سے اس میدان کا حسن اور بھی دوبالا ہو گیا ہے۔

ان دونوں میدانوں سے کہیں خوبصورت گلمرگ کا مرغزار ہے۔ اگرچہ مناظر کی دلکشی میں یہ میدان دوسرے میدانوں سے کمتر ہے لیکن آب و ہوا کے لحاظ سے یہ میدان سب سے اعلیٰ ہے۔ اسی وجہ سے لوگ اس کو بہت پسند کرتے ہیں۔ یہاں پر آبادی بھی کافی ہے۔ لوگوں نے اپنی تفریح طبع کے لئے گھوڑ دوڑ اور پولو وغیرہ کا میدان بنا لیا ہے۔ آبادی ہونے

کی وجہ سے یہاں گرجا گھر ڈاکخانہ اور کلب گھر بھی بن گئے ہیں اور روز نئی نئی عمارتیں بنتی رہتی ہیں۔ یہاں پر لوگ عموماً جون سے ستمبر تک رہتے ہیں۔ نومبر کے مہینہ سے برف باری ہونے لگتی ہے۔ اور مکانات آدھے آدھے برف سے ڈھک جاتے ہیں۔

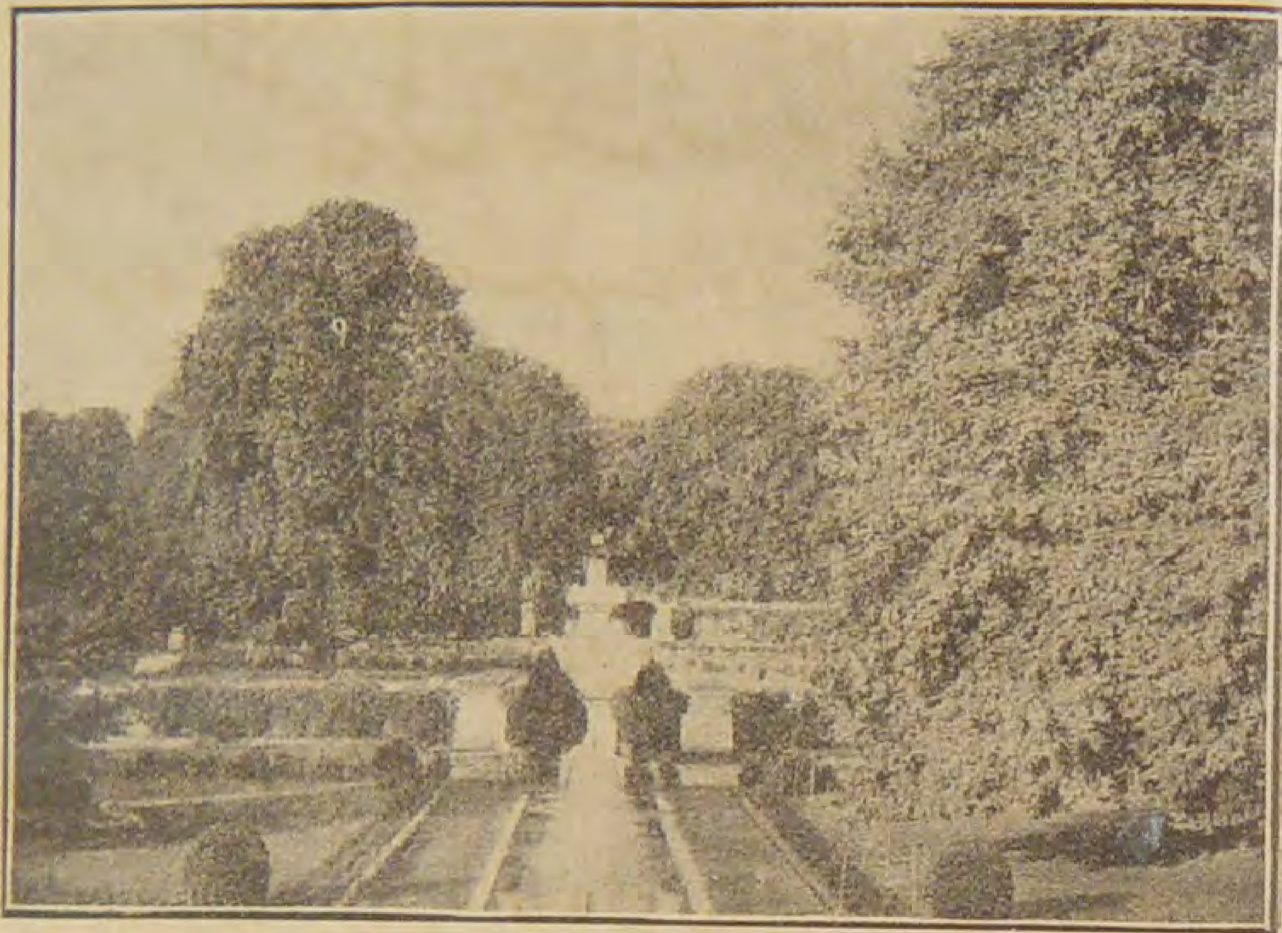
مہاراجہ صاحب گرمیوں میں کبھی کبھی یہاں آکر رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ رزیڈنٹ صاحب اور کشمیر کے اور دیگر رؤسائے بھی اپنے اپنے بنگلے یہاں بنوائے ہیں اور گرمی کے دن یہیں گذارتے ہیں۔ یہاں سے ایک طرف ننگا پربت کی چوٹی اور دوسری طرف سری نگر کا شہر صاف طور پر دکھائی دیتا ہے دریائے جہلم اس مقام سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا چاندی پگھلا کر زمین پر لنڈھا دی گئی ہے۔ اور اس کے کنارے کنارے کے گاؤں مختلف پہاڑوں کے سلسلے تالاب اور جھیلیں سب مل کر ایک بہت خوشنما منظر پیش کرتے ہیں۔

انہیں وجوہ سے لوگ گلمرگ کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اور جو سیاح باہر سے کشمیر کی سیر کو آتے ہیں ان کو بلا گلمرگ گئے ہوئے چین نہیں آتا۔

کشمیر کی دریائی زندگی

کشمیر کا خاص دریا جہلم ہے۔ یہ دریا تقریباً ۷۰ میل لمبا ہے۔ اور بالکل سری نگر کے شہر میں سے ہو کر بہتا ہے۔ یوں تو یہ دریا ورروان کے مقام سے نکلتا ہے لیکن اسلام آباد سے جو سری نگر سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر ہے بہت چوڑا ہو گیا ہے۔ سری نگر سے اسلام آباد تک برابر کشتیاں جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص کشمیر میں رہ کر وہاں کی دریائی زندگی کا لطف نہ اٹھاوے تو بڑا بدقسمت ہے کیونکہ یہ طرز زندگی صرف کشمیر کے لئے مخصوص ہے۔ لوگوں کو مکان سے زیادہ آرام کشتیوں میں ملتا ہے۔ دن بھر کشتیاں دریاؤں اور جھیلوں میں پڑی رہتی ہیں۔ رات کو کنارے پر لاکر باندھ دیجاتی ہیں۔ کشمیر کے قدرتی مناظر کا کماحقہ لطف انہیں کشتیوں پر رہ کر حاصل ہو سکتا ہے۔

تیس چالیس برس پہلے سری نگر میں ہاؤس بوٹ وغیرہ کا کوئی نام بھی نہ جانتا تھا۔ کشمیر میں ہاؤس بوٹ کے موجد۔ ایم۔ ٹی۔ کناڑ صاحب ہیں۔ فی زمانہ ان ہاؤس بوٹوں کا وہاں اس قدر رواج ہو گیا ہے کہ ہر وقت ہر قسم کے چھوٹے بڑے بوٹ دریائے جہلم





کشمیر میں کشتیوں پر مکانات (House boats)

جھیلوں اور نہروں میں مل سکتے ہیں۔

بڑی ہاؤس بوٹ میں عموماً پانچ کمرے ہوتے ہیں۔ بوٹ کے کمروں کی سجاوٹ آمدنی پر منحصر ہے۔ کھانا پکانے اور اسباب وغیرہ ساتھ رکھنے کے لئے ایک بوٹ الگ ہوتی ہے۔ ہر ایک بڑی بوٹ کے ساتھ ایک شکارا بھی ہوتا ہے۔ جس میں وقتاً فوقتاً لوگ بیٹھ کر چھچھلے پانی میں یا اس جگہ جہاں بڑی بوٹ نہیں جا سکتی سیر کرتے ہیں۔ شکارا بالکل ہمارے یہاں کے چھوٹی کشتی کا سا ہوتا ہے۔ جھیلم اور جھیلوں میں شکاروں کی ہر وقت بھرمار رہتی ہے۔ سیکڑوں اسجے سجائے شکارے ہر وقت پانی پر تیرتے رہتے ہیں۔

ہاؤس بوٹ ۵۰ روپیہ سے لیکر ۳۰۰ روپیہ تک کرایہ پر ہو سکتی ہے۔ کم کرایہ کی بوٹوں پر صرف چٹائی کی چھت اور چٹائی کی دیواریں ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے جن بوٹوں کا کرایہ زیادہ ہوتا ہے۔ ان میں سب کام لکڑی کا مضبوطی کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اوپر کی چھت بھی بہت لمبی چوڑی ہوتی ہے۔ جس کے اوپر بھی ایک سائبان لوگوں کے اٹھنے بیٹھنے کے لئے پڑا رہتا ہے۔ بڑی بوٹ دس یا بارہ فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں ہوتی لیکن

پچاس پچاس فٹ تک لمبی ہوتی ہے۔

انہیں ہاؤس بوٹوں پر رہ کر لوگ کشمیر کے دیہاتوں میں پہونچ سکتے ہیں اور ان کو وہاں کے لوگوں کی زندگی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے مقام کشمیر میں ایسے ہیں جہاں خشکی کے راستہ سے پہونچنا ناممکن کیا محال ہے۔ وہاں پہونچنے کے لئے صرف انہیں کشتیوں ہی کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔

دیہاتوں اور دوسری جگہوں کے علاوہ لوگ شکارہ میں بیٹھ کر سارے سری نگر کے شہر میں گھوم سکتے ہیں کیونکہ پورے شہر میں نہروں کا جال بنا دیا گیا ہے۔ یہ نہریں اس قدر چوڑی اور گہری ہیں کہ ان میں کشتیاں آسانی کے ساتھ چل سکتی ہیں۔ ان نہروں کے کنارے دو رویہ مکانات اور دوکانیں ہیں۔

جو لوگ دریائی زندگی کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں وہ زیادہ تر سری نگر سے کشتی کرایہ پر کر کے اسلام آباد تک جاتے ہیں۔ اس لئے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر کا بھی تھوڑا سا ذکر یہاں پر کر دیا جائے۔

سری نگر سے روانہ ہونے کے بعد سب سے پہلا گاؤں پنڈ وچک

کاملتا ہے۔ یہ گاؤں بالکل دریا کے کنارے واقع ہے یہ بہت پرانی آبادی ہے۔ یہاں جہانگیر کے زمانہ کا بنایا ہوا ایک پل اب تک موجود ہے لیکن بہت ردی حالت میں ہے۔ اس جگہ زعفران کی کاشت کثرت سے ہوتی ہے۔ مقامی لوگ زعفران کو زیادہ تر رنگنے کے کاموں میں استعمال کرتے ہیں۔ زعفران جولائی کے آخیر یا اگست کے شروع میں بوئی جاتی ہے اکتوبر تک اس میں پھول نکل آتے ہیں۔ اس وقت گاؤں کے سب لوگ مل کر ان پھولوں میں سے زعفران الگ کر لیتے ہیں وہ اس طرح کہ پہلے پھول توڑ کر دھوپ میں پھیلا دیئے جاتے ہیں۔ جب یہ پھول خشک ہو جاتے ہیں تو ان میں سے پہچان پہچان کر زعفران کے ڈنٹھل الگ کر لئے جاتے ہیں عموماً ایک پھول میں زعفران کے ۳ ڈنٹھل ہوتے ہیں۔ یہی اصلی زعفران ہوتی ہے۔

پنڈوچک سے روانگی کے بعد دوسرا گاؤں بام پور کا ملتا ہے۔ کسی زمانے میں یہ بہت بڑا شہر تھا لیکن پرانا شہر بالکل تباہ و برباد ہو کر اب صرف گاؤں رہ گیا ہے۔ اس گاؤں میں ایک بہت عمدہ چوبی پل دریا کو پار کرنے کے لئے بنا ہوا ہے۔ یہاں ایک

پرانی مسجد اور ایک کسی بزرگ کا روضہ بھی ہے۔ یہ تمام چیزیں
پرانے لوگوں کی یادگار ہیں اور وہاں کے باشندے اُن کو
متبرک سمجھ کر اس کی برابر نگہداشت کرتے رہتے ہیں اس وجہ
سے اب تک یہ چیزیں بدستور قائم ہیں ورنہ اور عمارتوں کی طرح
یہ سب بھی نیست و نابود ہو جاتیں۔

بام پور سے چار میل آگے وین کی آبادی ملتی ہے۔ یہاں پر ایک
بہت مشہور پانی کا چشمہ ہے۔ اس چشمہ کے پانی کی ایک خاصیت
یہ ہے کہ ہر ایک بیماری کو دور کرتا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے
کہ یہ چشمہ کسی گندھک کے کان سے ہو کر گذرتا ہے۔ اور اپنے پانی
میں اس کا اثر لیتا ہوا آتا ہے۔ گاؤں سے تھوڑی دور لاڈو کے
مقام پر بہت سی عمارتیں مندر اور زیارت گاہیں ہیں۔ یہاں ایک
مندر بالکل تالاب کے بیچ میں بنا ہوا ہے۔ اس میں جانے کے کئی
راستے ہیں۔ ایک راستہ جو باہر ہے وہ سب کو معلوم ہے لیکن جو راستہ
تالاب کے نیچے سے ہو کر جاتا ہے وہ اب کسی کو معلوم نہیں ہے۔

یہاں سے روانہ ہونے کے بعد اونتی پور کا گاؤں پڑتا ہے۔ کسی
زمانہ میں یہ کشمیر کا دارالسلطنت تھا۔ اس زمانہ میں کشمیر کی آبادی
قریب تیس لاکھ کے تھی۔ اس مقام پر بہت زیادہ کھنڈر پرانی

مسجدوں اور مندروں کے اب تک موجود ہیں لیکن کسی جگہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ عمارتیں کس زمانہ میں تعمیر ہوئی تھیں۔ ۱۸۶۵ء میں کچھ انگریز سیاحوں نے زمین کھود کر ایک پتھر برآمد کیا تھا جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عمارتیں ۸۵۲ء میں یا اسی کے قریب کسی زمانہ میں تعمیر ہوئی تھیں۔

اونتی پور سے روانہ ہونے کے بعد کشتی کی دوسری منزل بجبہارا (BIJBEHARA) میں ہوتی ہے۔ اس جگہ ایک بہت قدیم مندر قابل دید ہے۔ یہ مندر اشوک کے زمانہ میں تعمیر ہوا تھا۔ مندر کے علاوہ یہاں ایک پائیں باغ کے بھی کھنڈر ہیں۔ یہ باغ دریا کے دونوں کناروں پر آمنے سامنے لگا ہوا تھا۔ مگر لوگوں کی فلاکت اور بے توجہی سے یہ باغ بالکل تباہ و برباد ہوگیا ہے۔ اس قصبہ میں ایک محل بھی راجہ صاحب کا بنا ہوا ہے دیکھنے میں اس قصبہ کی آبادی بہت صاف ستھری ہے اور ہر ایک چیز کی دو دکانیں یہاں موجود ہیں۔ یہاں سے اسلام آباد بہت قریب ہے

مگر پانی چھچھلا ہونے کی وجہ سے کشتی برابر اسلام آباد تک نہیں جاتی بلکہ کنبال کے مقام تک جاکر رک جاتی ہے۔

جو مسافر اسلام آباد جانا چاہتے ہیں وہ کنبال میں اتر پڑتے ہیں۔ وہاں سے اسلام آباد تک تین گھنٹہ کا راستہ ہے۔

اسلام آباد اوائل زمانہ میں بہت بڑا شہر تھا۔ لیکن اب اسکی پہلی کی سی حالت نہیں رہ گئی۔ یہاں کی زیادہ تر قدیم عمارتیں تباہ و برباد ہوگئیں ہیں اور اب اس کی آبادی قریب ۸ یا دس ہزار کے ہے۔ یہ شہر پہاڑ کے دامن میں آباد ہے۔ یہاں بھی مہاراجہ صاحب کا ایک محل ہے۔ اس محل کے چاروں طرف پانی کے صاف چشمے ہیں۔ جن کے کنارے کنارے چنار کے درخت لگا دیئے گئے ہیں۔ محل کے علاوہ یہاں ایک بہت پرانی مسجد اور ایک روضہ بھی ہے۔

اسلام آباد کا خاص چشمہ اننت ناگ ہے۔ یہ چشمہ کرلیوا کے مقام سے نکلتا ہے اور گھومتا ہوا اس تالاب میں آگرتا ہے جو مہاراجہ صاحب کے محل کے سامنے ہے۔ اس تالاب میں رنگ برنگ کی مچھلیاں ڈال دی گئی ہیں اور اس میں کسی شخص کو شکار

کھیلنے کی اجازت نہیں ہے۔ پہلے لوگ اسی تالاب کا پانی پیتے تھے ایک مرتبہ یہاں بہت زبردست ہیضہ پھیلا اس وقت سے لوگوں نے اس کا پانی پینا چھوڑ دیا۔ اب پہاڑ پر ایک پختہ حوض بنا دیا گیا ہے۔ اس حوض میں اس چشمہ کا پانی نہر کے ذریعہ سے پہونچا دیا گیا ہے۔ اب لوگ یہی پانی استعمال کرتے ہیں۔

راجہ صاحب کے محل کی پہلی منزل میں ایک اسکول ہے جہاں لڑکوں کو انگریزی تعلیم دیجاتی ہے۔ محل کے بالکل سامنے سڑک کی دوسری طرف دوائی خانہ ہے جو غریبوں کے آرام کے لئے ریاست کے طرف سے جاری ہے۔ محل سے ۲۰۰ گز کے فاصلہ پر ایک چنار کا درخت ہے جس کی جڑ کے نیچے سے ایک گرم پانی کا چشمہ جاری ہے۔ جو ملک ناگ کے نام سے مشہور ہے یہ چشمہ بدستور سال بھر جاری رہتا ہے اور کبھی خشک نہیں ہوتا۔

اسلام آباد میں صنعت و حرفت پیشہ لوگ زیادہ آباد ہیں۔ سری نگر کی طرح یہاں بھی دریاں قالین۔ لکڑی کے منقش سامان اور چاندی کے برتن وغیرہ بہت اچھے بنتے ہیں لوگ انہیں چیزوں کو بیچ کر اس سے اپنی گذر اوقات کرتے ہیں۔ یہاں شیشہ آلات کا بھی کام ہوتا ہے اور ایک کارخانہ بھی ہے جس میں جھاڑ فانوس وغیرہ

ملتے ہیں۔ یہاں کے جھاڑ اور ہانڈیاں بہت نفیس ہوتی ہیں اور ہر وضع اور ہر رنگ کی بنائی جاتی ہیں۔

اسلام آباد سے دوسرے مشہور مقاموں کو مثلاً اچھپال مرتنڈ اور بھومجو کو سڑکیں جاتی ہیں۔

اچھپال کے مقام پر جہانگیر کی تعمیر کردہ ایک بارہ دری ہے۔ اس عمارت کا تھوڑا سا حصہ گر گیا ہے۔ اور بہت تھوڑی توجہ سے درست ہو سکتا ہے۔ مگر ابھی تک کسی ذمہ دار شخص نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔

مرتنڈ میں علاوہ پرانے مندروں کے ہاروت ماروت کے روضے اور چاہ بابل بھی ہے۔ چونکہ یہ سب چیزیں ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہیں اس لئے لوگ غول کے غول ان کو دیکھنے کے لئے جاتے ہیں۔

بھومجو میں چند غار ہیں جو ہندوؤں کے یہاں متبرک خیال کئے جاتے ہیں۔ یہ لوگ یہاں جاترا کے واسطے جاتے ہیں۔ ان غاروں کے اندر پہاڑ کاٹ کر مندر تعمیر کئے گئے ہیں۔ انہیں مندروں سے متصل بابا بام الدین اور رکن الدین رشی کے مزار ہیں یہ دونوں اشخاص مسلمانوں کے یہاں بزرگ مانے جاتے ہیں۔ یہاں ہر سال ایک بہت بڑا میلا ہوتا ہے جس میں دور و دراز

سے لوگ ان مزاروں کے زیارت کو آتے ہیں۔

کشمیر کی جھیلیں اور باغات

کشمیر کی مشہور جھیلیں سب سری نگر کے قرب و جوار میں ہیں۔ سب سے مشہور ڈل کی جھیل ہے۔ یہ جھیل ۵ میل لمبی اور ۲½ میل چوڑی ہے۔ اس کا پانی کبھی خشک نہیں ہوتا کیونکہ اول تو اس میں چاروں طرف سے چشمے آکر گرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ دریائے آرہ بھی اسی میں ہوکر بہتا ہے۔ جھیل کا پانی اس قدر صاف ہے کہ پہاڑوں کا عکس اس کے پانی میں پورے طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے کنارے پر چنار بید اور صنوبر کے بڑے بڑے درخت ہیں۔ ان درختوں کے علاوہ بہت سے اور خود رو درخت اور قسم قسم کی جھاڑیاں نمی کی وجہ سے کناروں پر اگ آتی ہیں جن کی وجہ سے جھیل کا حسن اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ جھیل کا نیلگوں پانی برف سے ڈھکے ہوئے سفید پہاڑوں سے ملکر ایسا دلکش منظر پیش کرتا ہے کہ ہر وقت باہر سے آنے والوں کا مجمع

لگا رہتا ہے۔ اکثر اشخاص اس جھیل کے قدرتی مناظر سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ جب تک کشمیر میں رہتے ہیں کشتیاں کرایہ پر لیکر ہر وقت ڈل لیک کی سیر کیا کرتے ہیں۔ کنارے کے علاوہ جھیل کے بیچ بیچ میں چھوٹے چھوٹے سرسبز جزیرے بھی ہیں جن میں باغ لگے ہوئے ہیں۔ فرصت کے وقت لوگ انہیں باغوں میں جاکر قدرتی مناظر کا لطف اُٹھاتے ہیں۔

جھیل کے کنارے کنارے متعدد گاؤں آباد ہیں۔ اس کے علاوہ سری نگر کے جتنے عمدہ عمدہ باغ ہیں وہ بھی اسی جھیل کے کنارے ہیں۔ ہر باغ میں اس جھیل سے ہوکر راستہ گیا ہے۔

ڈل کی جھیل میں جو چیز دیکھنے کے قابل ہے وہ وہاں کے تیرتے ہوئے باغ ہیں۔ لوگ جھیل میں سے گھاس اور سنوار کاٹ کر پانی میں دور تک پھیلا دیتے ہیں۔ اور ان کو باندہ کر اس پر کھاد ڈال دیتے ہیں۔ ان پر سردا۔ لوکی۔ ٹماٹر۔ اور دوسرے قسم کی ترکاریوں کی کاشت ہوتی ہے۔ یہ باغ پانی میں تیرتے پھرتے ہیں۔ جس وقت ان درختوں میں پھول نکلتے ہیں تو عجیب لطف دیتے ہیں۔ جب ترکاریاں تیار ہوجاتی ہیں

تو لوگ ان کو توڑ توڑ کر کشتیوں کے ذریعہ سے کنارے پر پہونچا دیتے ہیں۔

ایک دوسری بہت مشہور جھیل منسبل ہے۔ یہ جھیل سری نگر سے تھوڑے فاصلہ پر ہے اور دریائے سندھ اور پہاڑی سلسلوں کے درمیان واقع ہے۔ اس میں جانے کا صرف ایک تنگ راستہ ہے جس میں سے ایک وقت میں صرف ایک کشتی گذر سکتی ہے۔ قدرتی مناظر میں یہ جھیل ڈل کے جھیل کا مقابلہ نہیں کر سکتی پھر بھی یہاں کے قدرتی مناظر کافی دلکش ہیں۔ اس جھیل کے کنارے مغل بادشاہوں کے زمانہ کا لگایا ہوا ایک باغ ہے جو اب تک بہت اچھی حالت میں ہے۔

وولر کی جھیل بندی پور کے قریب ہے۔ اس جھیل میں سے دریائے سندھ ہو کر بہتا ہے۔ یہ جھیل اور جھیلوں کے مقابلہ میں زیادہ گہری ہے۔ گرمی کے شروع اور بہار کے موسم میں یہاں لوگ زیادہ آتے ہیں۔ سال کے باقی مہینوں میں یہاں مچھر اس قدر زیادہ پیدا ہوتے ہیں کہ لوگ ملیریا کے خوف سے یہاں آنے کی ہمت نہیں کرتے۔

ایک اور جھیل جس کو عموماً لوگ دیکھنے آتے ہیں گنگا بل کی ہے۔ یہ جھیل ہرمک پہاڑ پر ۱۲۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے

لوگوں کا خیال ہے کہ دریائے گنگا اسی جھیل سے نکلا ہے۔ اسی لئے وہاں کے مقامی لوگ اس جھیل کو بہت متبرک خیال کرتے ہیں اور اکثر تہواروں میں وہاں جاکر اشنان بھی کرتے ہیں جب زیادہ سردی پڑنے لگتی ہے تو جھیل کے پانی پر ایک ہلکی سی نہ برف کی جم جاتی ہے۔

سری نگر میں باغ بھی بہت کثرت سے ہیں کیونکہ آبپاشی کے لئے پانی بہت کافی مقدار میں ہر وقت مل سکتا ہے۔ ان میں زیادہ تر باغ ایسے ہیں جو مغل بادشاہوں نے اپنے زمانے میں لگوائے تھے۔ باغوں میں سب سے زیادہ مشہور شالامار کا باغ ہے۔ یہ اب تک شاہی باغ کہلاتا ہے۔ اس باغ کو جہانگیر نے لگوایا تھا۔ یہ باغ ۵۹۰ گز لمبا، ۲۶۷ گز چوڑا ہے۔ اس باغ میں جانے کا ایک راستہ نہر کے ذریعہ سے ہے۔ پہلے یہ راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ لیکن اب عام لوگ اس راستے سے جا سکتے ہیں۔ بجنسہ یہی حالت باغ کی بھی ہے۔ پہلے اس باغ میں جانے کے لئے لوگوں کو اجازت لینی پڑتی تھی مگر اب چار دیواری گر جانے کی وجہ سے عام اجازت ہو گئی ہے۔

جس نہر سے باغ میں جانے کا راستہ ہے اس کے دونوں کناروں پر

چنار اور بید کے سایہ دار درخت لگے ہوئے ہیں۔ کشتی انہیں درختوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی جاتی ہے۔ اس مقام پر بجد لطف آتا ہے۔ دھوپ کا یہاں پر کہیں نام نہیں ہوتا۔ جو کرنیں سورج کی درختوں سے چھن چھن کر پانی پر پڑتی ہیں وہ بالکل ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا صاف نیلگوں آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ پھولوں کی خوشبو سے راستہ میں دماغ معطر ہوتا رہتا ہے۔

پہلے اس باغ کی چہار دیواری صحیح وسالم تھی لیکن اب دیواروں کے گرجانے سے باغ ایک حد تک غیر محفوظ حالت میں ہے۔ باغ پکی روشوں کے ذریعہ سے برابر کے چار حصوں پر منقسم ہے۔ ہر حصہ کے بیچ میں ایک گنبد دار عمارت ہے۔ اور اس عمارت کے سامنے دو رنگ پکے حوض بنے ہیں جن میں ہر وقت پانی بھرا رہتا ہے اُس میں رنگ برنگ کی مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔ حوضوں کے کنارے پر بھی پکی روشیں بنی ہوئی ہیں۔ اور انہیں سے متصل خوبصورت پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ فاصلہ فاصلہ سے صنوبر اور چنار کے چھوٹے چھوٹے درخت لگا دئے گئے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جہانگیر اور نور جہاں ان سایہ دار روشوں پر مصروف گلگشت رہا کرتے تھے۔

مگر اب ان کے لگائے ہوئے باغوں سے دوسرے لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس باغ میں شاہجہاں کی بنوائی ہوئی سنگ موسیٰ کی ایک بارہ دری ہے۔ اس کے نقش و نگار ابھی تک بدستور قائم ہیں۔

چاندنی رات میں اس باغ کا منظر قابل دید ہوتا ہے۔ باغ کی خوبصورتی اس کے چاروں طرف کے قدرتی مناظر سے اور بھی بڑھ گئی ہے۔ باغ کے پیچھے مہادیو پہاڑ کی اونچی اونچی ہری بھری چوٹیاں ہیں اور سامنے ڈل کی جھیل ہے جس کے صاف اور شفاف پانی میں پیر پنجال پہاڑ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کا عکس پڑتا رہتا ہے۔

نشاط باغ اپنے پھولوں کی رنگینی اور خوبصورتی کے لئے مشہور ہے اسکا شمار ان چند یادگار باغوں میں ہے جو سلاطین مغلیہ نے کشمیر میں موسم گرما کے لئے لگائے تھے نشاط باغ کو نور جہاں کے بھائی آصف خاں نے لگوایا تھا۔ پہاڑ کا باغ ہونیکی وجہ سے اس کے کئی حصے ہیں۔ پہاڑ کی چڑھائی کی وجہ سے اس میں سیڑھیوں کی طرح بارہ اونچے اونچے چبوترے ہیں۔ باغ کی نہر انہیں چبوتروں پر سے گذرتی ہوئی مثل آبشار کے نیچے گرتی ہے۔ دور سے دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سبزہ زمین کے دوریشمی قالین جن پر گل بوٹے بنے ہوئے

ہوں سلامی زمین پر بچھا دیے گئے ہیں اور نہراں دولوں کے
درمیان حد فاصل ہے۔

شالامار باغ کی طرح یہاں بھی بہت سے فوارے اور مصنوعی
جھرنے ہیں جب شاہجہاں نے اس باغ کو دیکھا تو اس کو بہت
پسند آیا اور آصف خاں سے اس باغ کا خواستگار ہوا۔ لیکن
آصف خاں نے بادشاہ کے کہنے کی کچھ پرواہ نہ کی شاہجہاں نے
غصہ میں آ کر اس باغ میں پانی کا آنا بند کر دیا جس کی وجہ سے
باغ کی دلکشی میں روز بروز فرق آنے لگا لیکن بعد میں اس نے یہ
باغ آصف خاں کو بخش دیا اور کوئی تعرض نہ کیا۔

یہ باغ ۱۹۵ گز لمبا اور ۳۶ گز چوڑا ہے اصل باغ کی پشت
پر اسی سے ملا ہوا ایک زنانہ باغ ہے۔ یہ باغ مردانہ باغ سے
۱۸ فٹ بلند ہے دونوں باغوں کے درمیان میں ایک دیوار
حائل ہے زنانے باغ میں جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔
زنانہ باغ بالکل ہموار ہے۔ برخلاف اس کے مردانہ باغ میں
سب جگہ اتار چڑھاؤ ہے۔ نشاط باغ کی پرانی عمارتیں سب
منہدم ہو گئی ہیں۔ صرف تیسرے چبوترہ پر ایک پرانی عمارت
کے بنیاد پر اس زمانہ میں ایک بارہ دری بنوا دی گئی ہے۔

تہوار کے موقعوں پران باغوں میں بڑا جشن ہوتا ہے۔ اس دن باغ کی سب نہریں کھول دی جاتی ہیں حوضوں میں پانی بھر دیا جاتا ہے اور فوارے چھوٹنے لگتے ہیں۔ سڑک پر سیکڑوں موٹریں کھڑی رہتی ہیں۔ اور جھیلوں میں شکارے تیرتے پھرتے ہیں۔ باغوں کے آگے ہر قسم کی دوکانیں لگ جاتی ہیں۔ جس میں صرف باہر سے آنے والے ہی نہیں بلکہ خود سری نگر کے رہنے والے بھی شریک ہوتے ہیں۔ نشاط باغ کی روشوں پر بڑے بڑے سایہ دار درخت لگے ہوئے ہیں اور حاشیوں پر دورویہ سرو کی قطاریں ہیں باغ میں ہر طرف سبزہ لہلہاتا ہے۔ بیچ میں صاف پانی سے بھری ہوئی نہر آہستہ آہستہ بہتی چلی جاتی ہے ایک طرف ڈھالو پہاڑ کے سلسلے باغ سے ہزاروں فٹ اونچے دکھائی دیتے ہیں دوسری طرف جھیل کا ٹھہرا ہوا پانی معہ اپنے تمام قدرتی مناظر کے نگاہوں میں عجیب وغریب کیفیت پیدا کرتا ہے۔

نسیم باغ اپنے پر فضا روشوں۔ لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں اور دوب کی پٹریوں کی وجہ سے خوبی اور خوشنمائی میں تمام باغوں سے زیادہ ممتاز ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس مقام سے ڈل کی جھیل کا نظارہ دنیا کے تمامی مناظر سے زیادہ دلآویز ہے۔



شالا مار باغ-کشمیر

جہانگیر نے ایک مرتبہ اس منظر کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس جھیل کے پر فضا نظارے اور ان میں رنگین پھولوں کے عکس کی دلکشی کے مقابلہ میں جنت کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

سری نگر سے تھوڑے فاصلہ پر چشمہ شاہی کا باغ ہے۔ یہ باغ ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ باغ کے سامنے ہی جھیل ہے اور پیچھے اونچے اونچے پہاڑ ہیں جو ہر وقت ہر موسم میں ہرے بھرے رہتے ہیں۔ باغ سے متصل پری محل نام کا ایک پرانا محل ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ یہ تمام باغ زمانہ کے نشیب و فراز کی مرقعے ہیں جو مغلوں کی طرز معاشرت اور ان کی گذشتہ عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔ ان باغوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرتی حسن کی قدر کرنا مغل بادشاہ خوب جانتے تھے جو مقام انہوں نے قدرتی دلچسپی کے لحاظ سے عمدہ دیکھے ان کو تعمیر باغ کے لئے منتخب کر لیا۔

کشمیر کے پھل پھول اور جانور

کشمیر کی آب وہوا پھلوں کی کاشت کے لئے بہت موزوں ہے۔ ہر قسم کے خشک و تر میوے یہاں بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ پھلوں میں بیر۔ ناسپاتی۔ سیب۔ انگور۔ زردآلو اور شفتالو وغیرہ بہت کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تمام پھل اس قدر خوش رنگ اور خوش ذائقہ ہوتے ہیں کہ ایک مرتبہ چکھنے کے بعد پھر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ خشک میووں میں بادام۔ پستہ۔ اخروٹ۔ کشمش وغیرہ کافی مقدار میں پیدا ہوتے ہیں۔

یہ تمام میوے مقامی باشندوں کی ضرورت سے زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لئے جب فصل تیار ہو جاتی ہے تو زیادہ حصہ ان پھلوں اور میووں کا کشمیر سے باہر چلا جاتا ہے۔

چونکہ کشمیری ابھی تک باغبانی کے موجودہ طریقوں سے واقف نہیں ہیں۔ اس لئے وہ ان درختوں کی کافی نگہداشت نہیں کرتے جس کی وجہ سے درخت بہت جلد خراب ہو جاتے ہیں اور اچھے پھل نہیں دیتے۔ لوگوں نے اب اس کمی کو محسوس کیا ہے اور رفتہ رفتہ باغبانی کا کام سیکھ رہے ہیں۔ امید ہے کہ

آیندہ چل کر اُن کو اس کا بہت اچھا نتیجہ ملے گا۔

شہتوت کے درختوں کا کوئی حساب ہی نہیں ہے ان درختوں کی اس وجہ سے اور بھی نگہداشت ہوتی ہے کہ ان پر ریشم کے کیڑے پالے جاتے ہیں۔ اس کا پھل اس قدر میٹھا اور رسیلا ہوتا ہے کہ جو شخص عادی نہ ہو وہ دس بارہ سے زیادہ نہیں کھا سکتا۔

کشمیر کا سنگھاڑا بہت لذیذ میٹھا اور خوشبودار ہوتا ہے۔ وہاں کے لوگ کچا سنگھاڑا بھی کھاتے ہیں اور جب سنگھاڑے سخت ہو جاتے ہیں تو ان کو چھیل کر دھوپ میں خشک کر لیتے ہیں اور اسکا آٹا پیس کر اس کی روٹی پکاتے ہیں قریب قریب تمام جھیلوں میں سنگھاڑا بویا جاتا ہے۔

ملکو۔ جامن۔ آلو بخارا۔ ایسی چیزیں بھی یہاں پیدا ہوتی ہیں لیکن یہ سب چیزیں مقامی ضرورتوں میں کھپ جاتی ہیں اور باہر نہیں بھیجی جاتیں۔

جڑی بوٹیوں میں جو دوا کے کام میں آتی ہیں بنفشہ بہت زیادہ اور اعلیٰ درجہ کا پیدا ہوتا ہے جب بنفشہ کا پیڑ اُگتا ہے اور اس میں پھول آجاتے ہیں تو لوگ اس کو پہچان کر کاٹ لیتے ہیں اور دھوپ میں خشک کر لیتے ہیں۔ یہاں بنفشہ اس کثرت سے

پیدا ہوتا ہے کہ قریب قریب تمام ہندوستان میں یہیں سے
جاتا ہے اس کی اس قدر مانگ ہونے کی وجہ سے کچھ لوگوں نے
صرف اسی کی تجارت شروع کر دی ہے۔ یہ لوگ پہاڑوں
اور جنگلوں سے بنفشہ جمع کر کے اس کو بڑے فائدے سے دوسرے
ملکوں کو بھیجتے ہیں۔

ریوند چینی بھی یہاں بکثرت پیدا ہوتی ہے یہ محض ان پہاڑوں
پر اُگتی ہے جو کم از کم ....۱ فٹ اونچے ہیں۔ مصبر۔ دھتورا۔ بھنگ
اور نیل وغیرہ بھی یہاں پیدا ہوتی ہے۔

ان درختوں میں جن کی لکڑی کارآمد ہوتی ہے دیودار اور
سیدڑ کے درخت ہیں یہ درخت ...۴ اور ...۹ فٹ کی بلندی پر ہوتے
ہیں۔ خوبصورتی کے لحاظ سے چنار کا درخت سب سے اعلیٰ ہوتا ہے
اخروٹ کا درخت بھی اسی کا ہم پلّہ ہے قد و قامت اور سایہ کے
لحاظ سے بھی یہ درخت چنار سے کسی طرح کم نہیں ہوتا لیکن جس وقت
چنار کی پتیاں سرخ ہو جاتی ہیں اس وقت اس پر ایسا حسن آجاتا
ہے کہ اس کے سامنے اور درخت مات ہو جاتے ہیں۔

صنوبر کے درختوں میں پانی پڑنے کے بعد ایک عجیب قسم کی
لطیف خوشبو پیدا ہوتی ہے جس سے دماغ معطر ہو جاتا ہے۔

کشمیر میں بہت سے درخت ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی چھالیں جمع کر کے اس کا رنگ بنایا جاتا ہے۔ برچ کے درخت کی چھال سے ایک خاص قسم کا کاغذ گتہ پارچہ کے قسم کا بنایا جاتا ہے۔ کشمیر میں لوگ اس کو بجائے شیشوں کے دروازوں میں لگاتے ہیں۔

علاوہ باغوں کے اکثر جگہ پہاڑوں پر گلاب سورج مکھی اور مہندی کے خودرو درخت اُگتے ہیں۔ یہ درخت منظر کی دلکشی میں معاون ہونے کے علاوہ سیر کرنے والے کے دماغ کو معطر و معنبر کرتے رہتے ہیں۔

بیلا۔ چمیلی۔ جوہی وغیرہ کے پھول بھی میدان اور شہروں میں بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ کشمیر میں ان پھولوں سے محض آرائش و زیبائش کا کام لیا جاتا ہے۔

اور چیزوں کی طرح یہاں جانور بھی عجیب و غیر قسم کے دیکھنے میں آتے ہیں۔ یہاں ایک جانور مرمٹ نام کا ہوتا ہے یہ جانور قد میں بہت بڑا نہیں ہوتا۔ اس کے پشت پر بھورے اور ہلکے سرخ رنگ کے گل ہوتے ہیں۔ یہی اس کی خاص خوبصورتی ہے۔ بارہ سنگے اور پہاڑی بکریاں جن کو وہاں کے لوگ مرکھور کہتے ہیں۔ پہاڑوں پر کثرت سے رہتی ہیں۔ ان کی سینگیں بہت لمبی ہوتی ہیں

آدمی کو دیکھتے ہی یہ جانور اس قدر تیزی سے بھاگتے ہیں کہ دیکھتے دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

یہاں ہرن بھی ہوتے ہیں۔ ان کے نافوں سے مشک نکالا جاتا ہے۔ اس کے آگے کا حصہ تو بہت ہی خوبصورت ہوتا ہے مگر پچھلا دھڑ بہت بھدّا ہوتا ہے اور اس پر بڑے بڑے بال ہوتے ہیں۔ درندوں میں تیندوا۔ ریچھ۔ بھیڑئے اور جنگلی کتوں کی بہت کثرت ہے۔ ریچھ اخروٹ بہت کھاتا ہے۔ جب اخروٹ کی فصل تیار ہوتی ہے تو ریچھ کے جھنڈ پہاڑوں سے اتر آتے ہیں اور اکثر آدمیوں کو زخمی بھی کر دیتے ہیں۔

آبی جانوروں میں مچھلیاں ہر قسم کی کثرت سے دستیاب ہوتی ہیں۔ لوگ ان کو بہت خوشی سے کھاتے ہیں۔ علاوہ ملّاحوں کے وہاں کے باشندوں کو مچھلی کے شکار کا بہت شوق ہے۔ اکثر دیہاتوں میں چھوٹے چھوٹے لڑکے دریا یا تالاب کے کنارے مچھلیاں پکڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

پرندوں میں ہر قسم کے نیلے بھورے اور ہرے کبوتر جنگلوں میں اُڑتے پھرتے ہیں۔ لوگ ان کو جال میں پھنسا کر پالتے ہیں۔ شہر سے زیادہ لوگ دیہات میں کبوتر پالتے ہیں جس وقت بط

اور کوئل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس وقت ہندوستان کے باغ یاد آجاتے ہیں۔

ایک چڑیا بالکل سنہرے رنگ کی کبھی کبھی دکھائی دیتی ہے جب اس پر دھوپ پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پروں پر سونا چڑھا دیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قدرت کے جلووں سے کشمیر کی سرزمین جنت کا نمونہ بنی ہوئی ہے۔ کشمیر کی پورے طور پر سیر کرنے کے بعد یہی شعر بے اختیار زبان پر جاری ہوتا ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

تمام شد